اس شمارے میں

حرفِ اوّل

حکمتِ نبوی ﷺ	حافظ عاطف وحید	2

مطالعۂ قرآن حکیم

تعارفِ قرآن (۷)	ڈاکٹر اسرار احمد	5

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	لطف الرحمٰن خان	7

نباتاتِ قرآن

ضریع	سید قاسم محمود	27

علوم القرآن

قرآن کا اندازِ خطاب اور اس کی اقسام	امام بدرالدین زرکشی	29

اسلام اور عصر حاضر

دورِ جدید کا علمی چیلنج اور اس کا حل	غلام اللہ خان حقانی	45

تعارف و تبصرہ

	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	62

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارہ تحریر:

حافظ عاطف وحید

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی ۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۴ | جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ ۔ جولائی ۲۰۰۵ء | شمارہ ۷

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ ۔ کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور ۱۴ ۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے ' فی شمارہ: 10 روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے ' امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (ایک دن) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

اے مہاجرین کی جماعت! پانچ خصلتیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ تمہاری آزمائش کی جائے گی۔ اور میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ خصلتیں تم میں پیدا ہوں:

۱) جب کسی قوم میں بے حیائی عام ہو جائے' یہاں تک کہ لوگ علی الاعلان بے حیائی کے کام کرنے لگیں تو اُس قوم میں طاعون اور درد والم والی ایسی بیماریاں عام ہو جائیں گی جو اُن کے پہلے آباء واجداد میں نہ ہوں گی۔

۲) اور جب کسی قوم کے لوگ ماپ تول میں کمی کرنے لگیں گے تو قحط سالی اور سخت تکالیف میں مبتلا ہوں گے اور اُن پر ظالم حکمران مسلط ہو جائیں گے۔

۳) اور جب لوگ اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا نہ کریں گے تو آسمان سے بارانِ رحمت ان سے روک لی جائے گی۔ اور اگر زمین پر چرند پرند نہ ہوتے تو اُن پر بارش بالکل ہی نہ برسائی جاتی۔

۴) اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا عہد توڑ دیں گے تو اللہ تعالیٰ اغیار میں سے ان پر ایک دشمن مسلط کر دے گا جو ان کے مال واسباب میں سے بعض کو اپنے قبضہ میں لے لے گا۔

۵) اور جب ان کے حکمران کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کریں گے اور اللہ کی نازل کردہ شریعت میں سے بعض احکامات کو اختیار کریں گے (اور بعض کو ترک کر دیں گے) تو اللہ تعالیٰ ان کے مابین لڑائی اور عداوت پیدا کر دیں گے۔

اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کے لفظ مسند بزار اور بیہقی کے ہیں۔ اسی طرح اس کو امام حاکم نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث امام مسلمؒ کی شرائط پر صحیح حدیث ہے۔

حدیثِ نبویؐ کے اِس آئینے میں ہم اپنے معاشرے کی تصویر دیکھیں تو انتہائی مکروہ صورت نظر آتی ہے۔ اس ذلت و پستی کی دلدل سے نکلنے کے لیے قرآن و حدیث کی روشنی میں چند نکات پیش خدمت ہیں۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ۔

حرام کمائی سے بچنے کے لیے آمدنی کے ان ذرائع سے اجتناب لازمی ہے:

۱) **سود**: عقیدے میں 'شرک' اور عمل میں 'سودی کمائی' سب سے بڑے گناہ ہیں۔ سود کو ترک نہ کرنے والوں کے خلاف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ اور جس قوم کے خلاف اللہ کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا ہو اس کی بدنصیبی اور بدحالی کا کیا ٹھکانہ! پس لازم ہے کہ سودی بینکوں سے سودی قرض مت لیے جائیں' سودی کھاتے نہ کھلوائے جائیں' سودی بونڈز اور سرٹیفکیٹس نہ خریدے جائیں۔ حلال ہی پر قناعت کی جائے۔ اللہ جائز بچتوں اور حلال کی کمائی میں برکت ڈالتا ہے۔ سودی کمائی صرف ظاہر میں بڑھتی ہے' حقیقت میں یہ سراسر نقصان اور دھوکہ ہے۔ اس کمائی سے سوائے پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا! اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے: یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ (البقرۃ:۲۷۶) ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے''۔

۲) **جوا اور لاٹری**: اللہ تعالیٰ نے جوئے' سٹے اور لاٹری کی ممانعت کر دی ہے اور قرآن حکیم میں انہیں رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ یعنی گندے شیطانی کام قرار دیا گیا ہے۔ (المائدۃ:۹۰) یہ اور ان جیسے تمام کام صرف راتوں رات امیر بننے کا حسین فریب ہیں۔ اس سے مال کی محبت اور easy money کی خواہش میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ خواہش انسانوں کی عاقبت کے لیے تباہ کن ہے۔ اس کے برعکس اصل بابرکت مال وہ ہے جو انسان محنت سے کمائے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ''بے شک تمہاری کمائی میں سے سب سے زیادہ پاک اور عمدہ وہ ہے جو تم نے محنت سے کمایا ہو''۔

بدقسمتی سے راتوں رات لکھ پتی اور کروڑ پتی بنانے کی ترغیبات آج ہر چیز میں ڈالی جارہی ہیں۔ سافٹ ڈرنک خریدیے تو لکھ پتی بنیے! پٹرول خریدیے تو کروڑ پتی بنیے! یہاں تک کہ سکول یا کالج میں داخلہ لیجیے تو کوئی دلفریب انعام جیتیے۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہے! معزز قارئین! اللہ نے ایسی تجارت کو حلال قرار دیا ہے جس میں خرید وفروخت کرنے والوں کو خوب وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کیا لینا ہے اور کیا دینا ہے۔ خرید وفروخت کے ساتھ ''اَن دیکھی منفعت'' سراب اور دھوکہ ہے۔ اس سے اجتناب کریں اور اس کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کریں۔

۳) **ضرر رساں اشیاء کی فروخت**: اللہ تعالیٰ نے تمام پاک اور طیّب چیزوں کو حلال اور تمام ناپاک اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ناپاک اور خبیث چیزیں انسان کے مادی اور روحانی دونوں وجودوں کے لیے نقصان کا باعث ہیں۔ اسی لیے ان کی پیداوار' خرید وفروخت اور ان کا استعمال ممنوع کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسی تمام اشیاء کی تجارت سے اجتناب کریں جن میں ظاہری یا باطنی نجاست پائی جاتی ہو' مثلاً مردار اور حرام جانور جیسے خنزیر اور کتا وغیرہ' خون' انسانی اعضاء' نشہ آور اشیاء وغیرہ۔ اسی طرح سفلی جذبات کو اشتعال دینے والے افعال اور اشیاء' مثلاً رقص وسرود' سینما' قحبہ گری' وغیرہ کو کلیۃً ترک کر دیں۔ مزید برآں اسراف وتبذیر کو فروغ دینے والے جملہ محرکات اور ان کی خرید وفروخت بھی ترک کر دینی چاہیے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے متذکرہ بالا فرمانِ مبارک پر غور کریں تو ہماری موجودہ بدحالی کی ''اصل وجوہات'' خود بخود سمجھ آ جاتی ہیں۔ اِن حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس حدیث میں بیان کردہ گناہوں سے نہ صرف اپنا دامن بچائیں بلکہ اپنے معاشرے کو ان منکرات سے پاک کرنے کے ضمن میں اجتماعی جدوجہد کریں۔ اس طرح ان شاء اللہ العزیز دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمارے شامل حال ہوگی اور اللہ تعالیٰ ہمیں اُخروی کامیابی سے بھی سرفراز فرمائے گا۔ ○○

تعارفِ قرآن (۷)

از: ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن ''حبل اللہ'' ہے!

جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ''حبل اللہ'' ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ''حَبل'' کے ایک معنی رسّی کے ہیں اور یہی اصل معنی ہیں۔ سورۃ اللّھب میں یہ لفظ آیا ہے: حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ یعنی مونج کی بٹی ہوئی رسّی۔ امام راغبؒ نے اس کی تعبیر کی ہے: ''استعیر للوصل ولکل ما یتوسل بہ الی شیء'' یعنی کسی شے سے جڑنے کے لیے اور جس شے سے جڑا جائے اس کے لیے استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عہد' قول وقرار اور میثاق دو فریقوں کو باہم جوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ عہد کے معنی میں بھی آتا ہے' اور قرآن حکیم میں یہ ایسے عہد کے لیے آیا ہے جس سے کسی کو امن مل رہا ہو' حفاظت اور امان حاصل ہو رہی ہو۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۱۲) میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ

''یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی' سوائے اس کے کہ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں' ان پر محتاجی ومغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔''

گویا خود اپنے بل پر' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر' خود مختاری کے بل پر اُن کے لیے عزت کا معاملہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کی پیشین گوئی ہے اور موجودہ ریاست

اسرائیل اس کا واضح ثبوت ہے۔ امریکہ اگر ایک دن کے لیے بھی اپنی حفاظت ہٹا لے تو اسرائیل کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

قرآن مجید میں اہل ایمان سے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو سب مل کر''۔ البتہ ''حبلُ اللہ'' کیا ہے؟ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ اور قرآن مجید میں جو بات پوری طرح واضح نہ ہو' مجمل ہو' اس کی تشریح اور تبیین رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾ (النحل:۴۴) ''اور ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف 'الذکر' نازل کیا' تاکہ جو چیز اُن کے لیے اتاری گئی ہے آپ اسے واضح کریں''۔ چنانچہ احادیث نبویؐ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ''حبلُ اللہ'' قرآن مجید ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ ' اَحَدُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ.....))

''آگاہ رہو! میں تمہارے مابین دوخزانے چھوڑے جا رہا ہوں' اُن میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے' وہی حبلُ اللہ ہے.....''

قرآن حکیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے' جس میں الفاظ آئے ہیں: ((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ یہ روایت سنن ترمذی اور سنن دارمی میں موجود ہے۔ مزید برآں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت رزین میں آئی ہے اس میں بھی یہی الفاظ ہیں: ((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ سنن دارمی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ حَبْلُ اللّٰہِ وَالنُّوْرُ الْمُبِیْنُ)) ''یقیناً یہ قرآن حبلُ اللہ اور نورِ مبین ہے''۔

قرآن کو ''رسّی'' کس اعتبار سے کہا گیا ہے' اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو بندہ اس رسی کے ذریعے اللہ سے جڑتا ہے۔ یہ رسی ہمیں اللہ سے جوڑنے والی ہے۔ ''تعلق مع اللہ'' اور ''تقرب الی اللہ'' دونوں تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ تعلق کے معنی ہیں لٹک جانا۔ ''علق'' لٹکی ہوئی شے کو کہتے ہیں۔ ''تعلق مع اللہ'' کا مفہوم ہوگا اللہ سے لٹک جانا' یعنی اللہ سے چمٹ جانا' اللہ کے ساتھ جڑ جانا۔ اسی طرح ''تقرب الی اللہ'' کا مطلب ہے اللہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنا۔ سلوک اور طریقت کا مقصد یہی ہے۔ تعلق مع اللہ میں اضافے اور تقرب الی اللہ کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔

اس اعتبار سے دو حدیثیں ملاحظہ کیجیے۔ ایک کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلْقُرْآنُ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ)) ''یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ یہی الفاظ حضرت زید بن ارقم ؓ سے مرفوعاً بھی روایت کیے گئے ہیں۔ یعنی اگر اللہ سے جڑنا ہے' اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے تو اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو' اس سے تم اللہ سے جڑ جاؤ گے' اللہ کا قرب حاصل کرلو گے۔

دوسری معجم کبیر طبرانی کی بڑی پیاری روایت ہے۔ اس میں اِن الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ حضور ﷺ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو آپؐ نے مسجد کے گوشے میں دیکھا کہ کچھ صحابہ ؓ قرآن کا مذاکرہ کر رہے تھے' قرآن کو سمجھ اور سمجھا رہے تھے۔ حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور بڑا پیارا سوال کیا: ((اَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟)) ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' صحابہ ؓ کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ' ہم اس کے گواہ ہیں! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُهٗ بِاَیْدِیْکُمْ وَطَرَفُهٗ بِیَدِ

اللّٰہِ)) ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ یہ قرآن وہ شے ہے جس کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ اِن احادیث مبارکہ سے ''حبل اللہ'' کا یہ تصور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی شے ہے۔

ابھی ہم نے جس حدیث کا مطالعہ کیا اس میں قرآن حکیم کے لیے ''جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ'' کے الفاظ آئے ہیں' کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ مستدرک حاکم اور مراسیل ابی داؤد میں حضرت ابوذر غفاری ؓ سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے: ((اِنَّکُمْ لَا تَرْجِعُوْنَ اِلَی اللّٰہِ بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِمَّا خَرَجَ مِنْہُ یَعْنِی الْقُرْآنَ)) یعنی تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود اُسی (اللہ تعالیٰ) سے نکلی ہے' یعنی قرآن مجید۔ درحقیقت قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے' تو اس سے بڑھ کر قریب ہونے کا کوئی اور ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو گویا وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ تبع تابعین کے دَور کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ سال میں چھ مہینے سرحدوں پر جہاد میں شریک ہوتے۔ اُس دَور میں دارالاسلام کی سرحدیں بڑھ رہی تھیں اور اس کے لیے جہاد جاری تھا۔ جبکہ چھ مہینے آپ ؒ گھر پر گزارتے اور اِس عرصے میں لوگوں سے ملنے جلنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ صرف نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتے' باقی وقت گھر پر ہی رہتے۔ کسی نے کہا کہ عبداللہ! آپ تنہائی پسند ہو گئے ہیں' تنہائی سے آپ کی طبیعت اکتاتی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''کیا تم اُس شخص کو تنہا سمجھتے ہو جو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے؟'' لوگ حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جب اس کی وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا کہ دیکھو جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو قرآن پڑھتا ہوں یا حدیث پڑھتا ہوں۔ جب قرآن پڑھتا ہوں تو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہوں اور جب حدیث پڑھتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہوں۔ تم مجھے تنہا نہ سمجھو۔

دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا
عالم ہے اِن گلوں میں' پھولوں میں بستیاں ہیں!

مسند احمد' ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث نبویؐ منقول ہے:

((یُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُهَا))

''(قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور (جنت کے درجات پر) چڑھتا جا' اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ پس تیرا مقام وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے''۔

لیکن واضح رہے کہ صاحب قرآن سے مراد صرف حافظ قرآن یا ہمارے ہاں پائے جانے والے قاری نہیں ہیں' بلکہ وہ حافظ اور قاری مراد ہیں جو قرآن کے علم و حکمت سے بھی واقف ہیں' اس کو پڑھتے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ جنت میں اس قرآن کے ذریعے ان کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی اور ان کا آخری مقام وہاں معین ہوگا جہاں ان کا سرمایۂ قرآن ختم ہوگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ اور وصل الی اللہ کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ میں نے اسی لیے امام راغبؒ کے الفاظ کا حوالہ دیا تھا کہ ''حبل'' کا لفظ وصل کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے اور یہ ہر اُس شے کے لیے استعمال ہوگا جس کے ذریعے کسی شے کے ساتھ جڑا جائے۔ اس معنی میں حبل اللہ قرآن مجید ہے۔

اگر پیراشوٹ کی مثال سامنے رکھیں تو جملہ ایمانیات اس قرآن کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جس طرح پیراشوٹ کی چھتری کی رسیاں نیچے آ کر ایک جگہ جڑ جاتی ہیں۔ جب پیراشوٹ کھلتا ہے تو اس کی چھتری کس قدر وسیع ہوتی ہے' لیکن اس کی ساری رسیاں ایک جگہ آ کر جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایمانیات کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب قرآن کے ساتھ منسلک ہیں۔ چنانچہ قرآن پر یہ یقین

مطلوب ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' بلکہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ کلام بھی ذاتِ باری تعالیٰ ہی سے صادر ہوا ہے اور میری روح بھی اللہ ہی کے امرِ کُن کا ظہور ہے۔ اس انداز سے قرآن پر یقین' اللہ تعالیٰ پر یقین اور قرآن لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ پر یقین مطلوب ہے۔ (''حقیقت ایمان'' کے موضوع پر میری پانچ تقاریر میں یہ مضمون آ چکا ہے)۔

ایک ایمان تو تقلیدی ہے' یعنی غیر شعوری ایمان' کہ ایک یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' چاہے وہ علیٰ وجہ البصیرت نہ ہو' اور وہ بھی بہت بڑی دولت ہے' لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی ایمان وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت ہو۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (یوسف:۱۰۸) ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور جو میرے ساتھ ہیں (وہ بھی)''۔ علیٰ وجہ البصیرت ایمان یعنی شعوری ایمان' اکتسابی ایمان اور حقیقی ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ مولانا ظفر علی خان بہت ہی سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کر گئے ہیں:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

عاقل یعنی غور و فکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے کے لیے ایمان کا منبع و سرچشمہ صرف قرآنِ حکیم ہے۔

قرآن حکیم کے ''حبل اللہ'' ہونے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اہل ایمان کو جوڑنے والی رسّی' ان کو باہم ایک دوسرے سے باندھ دینے والی شے' ان کو بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز یہ قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی باہم متفرق ہونے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر اور تفرقہ مت ڈالو!'' اہل ایمان کو جوڑنے والی

اور بنیانِ مرصوص بنانے والی رسی یہی قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ انسانی اتحاد وہی مستحکم اور پائیدار ہوگا جو فکر و نظر کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ بہت سے اتحاد وقتی طور پر وجود میں آ جاتے ہیں۔ جیسے کچھ سیاسی مصلحتیں ہیں تو اتحاد قائم کر لیا' کوئی دنیاوی مفادات ہیں تو ان کی بنا پر اتحاد قائم کر لیا۔ یہ اتحاد حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ہی پائیدار اور مستحکم ہوتے ہیں۔ انسان حیوانِ عاقل ہے۔ یہ سوچتا ہے' غور کرتا ہے' اس کے نظریات ہیں' اس کے کچھ اہداف و مقاصد ہیں' کوئی نصب العین ہے۔ نظریات' مقاصد اور نصب العین کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ تو جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہو کوئی اتحاد پائیدار اور مستحکم نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھامو گے تو گویا دو رشتے قائم ہو گئے۔ ایک رشتہ اہل ایمان کا اللہ کے ساتھ اور ایک رشتہ اہل ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ ——— جیسے کُل شریعت کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی سب سے بڑی عبادت نماز ہے اور بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی شے زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح حبل اللہ ایک طرف اہل ایمان کو اللہ سے جوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اہل ایمان کو آپس میں جوڑ رہی ہے۔ یہ انہیں بنیانِ مرصوص اور ''کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ'' بنا دینے والی شے ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے کہا ہے:

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کُن کہ حبل اللہ اوست!

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! تو قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کہ 'حبل اللہ' یہی ہے''۔

حبل اللہ کے بارے میں مفسرین کے ہاں بہت سے اقوال ملتے ہیں کہ حبل اللہ

سے مراد قرآن ہے' کلمہ طیبہ ہے' اسلام ہے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن احادیث نبویؐ کی روشنی میں اس کا مصداقِ کامل قرآن ہی ہے۔ اور پھر اس کی جس قدر عمدہ تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے' یہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی میرے نزدیک بہت عمدہ مقام ہے:۔

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ کے الفاظ کے بعد فرمایا گیا ہے: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو کہ جب تم باہم دشمن تھے' پھر اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا تو تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے''۔ یہ قرآن مجید ہی ہے جو اہل ایمان کے دلوں کو جوڑتا اور ان کو باہم پیوست کرتا ہے' اور یہ دلی تعلق اور دلی ہم آہنگی ہی ہے جو مسلمانوں کو بنیانِ مرصوص بنانے والی شے ہے۔

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

تعارفِ قرآن کے ضمن میں جو کچھ میں نے عرض کیا ان سب باتوں کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے وہ کیا ہے؟ یعنی قرآن حکیم کے بارے میں مجھ پر اور آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس کے اعتبار سے میں خاص طور پر اپنی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری تحریک رجوع الی القرآن کے لیے دو بنیادوں میں سے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا تھا۔ ابتدائی چھ سات سال تو میں تنہا تھا۔ نہ کوئی انجمن تھی' نہ کوئی ادارہ' نہ جماعت۔ پھر انجمن خدام القرآن قائم ہوئی' پھر ۱۹۷۷ء میں قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ قرآن اکیڈمی کی تعمیرات مکمل ہونے کے بعد پھر اسی کے بطن سے قرآن کالج کی ولادت ہوئی' جس کے سر پر قرآن آڈیٹوریم کا تاج سجا ہوا ہے۔ اس پوری جدوجہد کی

بنیاد اور اساس دو کتابچے ہیں: (۱) ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام''۔ یہ مضمون میں نے ۱۹۶۷ء میں میثاق کے اداریے کے طور پر لکھا تھا۔ (۲) ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق''۔ یہ کتابچہ میری دو تقریروں پر مشتمل ہے جو میں نے ۱۹۶۸ء میں کی تھیں۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں جشن خیبر اور جشن مہران وغیرہ جیسے مختلف عنوانات سے جشن منائے جا رہے تھے' جن میں راگ رنگ کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ صدر ایوب خان کا زمانہ تھا۔ اگرچہ شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے' لیکن ''سب اچھا ہے'' کے اظہار کے لیے یہ شاندار تقریبات منعقد کی جا رہی تھیں۔ یہ گویا اُن کے دورِ حکومت کی آخری بھڑک تھی' جیسے بجھنے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے: ع ''مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے!'' لیکن اُن دنوں ذکر و فکر کی بجائے لوگوں کو راگ رنگ کی محفلوں میں مست رکھنے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں مذہبی لوگوں کو رشوت کے طور پر ''جشنِ نزولِ قرآن'' عطا کیا گیا کہ تم بھی جشن مناؤ اور اپنا ذوق و شوق پورا کر لو۔ چنانچہ چودہ سو سالہ ''جشنِ نزولِ قرآن'' کا انعقاد ہوا۔ اس کے ضمن میں قراءت کی بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوئیں' جن میں پوری دنیا سے قرّاء حضرات شریک ہوئے۔ اسی سلسلے میں سونے کے تار سے قرآن لکھنے کا پروجیکٹ شروع ہوا۔

اُس وقت میرا ذہن منتقل ہوا کہ کیا قرآن حکیم کا ہم پر یہی حق ہے؟ کیا اپنے ان کاموں سے ہم قرآن مجید کا حق ادا کر رہے ہیں؟ چنانچہ میں نے مسجد خضراء سمن آباد میں اپنے دو خطاباتِ جمعہ میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق بیان کیے کہ ہر مسلمان پر حسبِ استعداد قرآن مجید کے پانچ حق عائد ہوتے ہیں:

۱) اسے ماننے جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔ (ایمان و تعظیم)
۲) اسے پڑھے جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ (تلاوت و ترتیل)
۳) اسے سمجھے جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔ (تذکر و تدبر)

۴) اس پر عمل کرے جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے۔ (حکم و اقامت)

انفرادی زندگی میں حکم بالقرآن یہ ہے کہ ہماری ہر رائے اور ہر فیصلہ قرآن پر مبنی ہو۔ اور اجتماعی زندگی میں قرآن پر عمل کی صورت اقامت ما انزل من اللہ یعنی قرآن کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (المائدۃ:۶۸)

''اے کتاب والو! تمہارا کوئی مقام نہیں جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے ربّ کی طرف سے''۔

۵) قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا اور عام کرنا۔ (تبلیغ و تبیین)

ان پانچ عنوانات کے تحت الحمد للہ ثم الحمد للہ یہ بہت جامع کتابچہ مرتب ہوا اور بلامبالغہ یہ لاکھوں کی تعداد میں چھپا ہے۔ پھر انگریزی' عربی' فارسی اور سندھی میں اس کے تراجم ہوئے۔ جو حضرات بھی ہماری اس تحریک رجوع الی القرآن سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں' میرے دروس میں شریک ہوتے ہیں یا ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں میرا ناصحانہ مشورہ ہے کہ اس کتابچے کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ درحقیقت ''تعارفِ قرآن'' پر میرے خطابات کا لازمی نتیجہ اور ان کا ضروری تکملہ ہے۔

یہ بھی جان لیجیے کہ اگر ہم یہ حقوق ادا نہیں کرتے تو از روئے قرآن ہماری حیثیت کیا ہے۔ قرآن مجید کے حقوق کو ادا نہ کرنا قرآن کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔ سورۃ الفرقان میں محمد رسول اللہ ﷺ کی فریاد نقل ہوئی ہے:

﴿ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾

''اور پیغمبر کہے گا کہ اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کے ذیل میں حاشیہ میں لکھا ہے:

''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبر نہ کرنا' اس پر عمل نہ کرنا' اس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیح قراءت کی

طرف توجہ نہ کرنا' اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا' یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں''۔

بحیثیت مسلمان ہم پر قرآن مجید کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں' اگر انہیں ہم ادا نہیں کر رہے تو حضور ﷺ کے اس قول اور فریاد کا اطلاق ہم پر بھی ہوگا۔ گویا کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے خلاف مدعی کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔

علامہ اقبال اسی آیت قرآنی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!''

قرآن مجید میں دو مقامات پر قرآن کے حقوق ادا نہ کرنے کو قرآن کی تکذیب قرار دیا گیا ہے۔ آپ لاکھ سمجھیں کہ آپ قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں' لیکن اگر آپ اس کے حقوق کی ادائیگی اپنی استعداد کے مطابق' اپنی امکانی حد تک نہیں کر رہے تو درحقیقت قرآن کو جھٹلا رہے ہیں۔ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود کے بارے میں سورۃ الجمعہ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''مثال ان لوگوں کی جو حاملِ تورات بنائے گئے' پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا اُس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ بُری مثال ہے اُس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

ہمیں کانپنا چاہیے' لرزنا چاہیے کہ کہیں ہمارا شمار بھی انہی لوگوں میں نہ ہو جائے۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ الواقعہ کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات ہیں:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝

''پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی' اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے' کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے' ایک محفوظ کتاب میں ثبت' جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو' اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟''

اس قرآن' اس عظمت والی کتاب' جو کتاب کریم ہے' کتاب مکنون ہے' کے بارے میں تمہاری یہ سستی' تمہاری یہ کسل مندی' تمہاری یہ ناقدری اور تمہارا یہ عملی تعطل کہ تم اسے جھٹلا رہے ہو! تم نے اپنا حصہ اور نصیب یہ بنا لیا ہے کہ تم اس کی تکذیب کر رہے ہو؟ تکذیب اس معنی میں بھی کہ قرآن کا انکار کیا جائے' اسے اللہ کا کلام نہ مانا جائے — اور تکذیب عملی کے ضمن میں وہ چیز بھی اس کے تابع اور شامل ہو گی جو میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی حاملِ کتابِ الٰہی ہونے کے باوجود اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے کہ ہم بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص کو ان حقوق کے ادا کرنے کی اپنی امکانی حد تک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

از: لطف الرحمٰن خان

نظر ثانی: حافظ نذیر احمد ہاشمی

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۱۵۴

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

ترکیب: ''واؤ'' عاطفہ ''وَلَا تَقُوْلُوْا'' فعل نہی فاعل واؤ ضمیر۔ ''لِمَنْ'' میں ''لام'' حرف جر ''مَنْ'' اسم موصول ''يُقْتَلُ'' فعل مضارع مجہول۔ اس میں ضمیر ''هُوَ'' راجع بسوئے ''مَنْ'' ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' جار و مجرور متعلق ''يُقْتَلُ''۔ فعل + نائب فاعل + متعلق جملہ فعلیہ ہو کر ''مَنْ'' کا صلہ۔ موصول صلہ مل کر مجرور لام حرف جار کا۔ جار مجرور مل کر متعلق ''لَا تَقُوْلُوْا''۔ ''اَمْوَاتٌ'' خبر مبتدا محذوف ''هُمْ''۔ مبتدا خبر مل کر جملہ اسمیہ ہو کر مقولہ ''لَا تَقُوْلُوْا'' کا۔ فعل + فاعل + مقولہ مل کر معطوف علیہ۔ ''بَلْ'' حرف اضراب وعطف۔ ''اَحْيَاۗءٌ'' خبر مبتدا محذوف ''هُمْ''۔ ''واؤ'' حالیہ ''لٰكِنْ'' مخففہ من المعلقہ مہملہ۔ ''لَا تَشْعُرُوْنَ'' فعل + فاعل جملہ فعلیہ ہو کر حال ''هُمْ'' ضمیر مبتدا ہے۔

ترجمہ

وَلَا تَقُوْلُوْا: اور تم لوگ مت کہو	لِمَنْ: ان کے لیے جو
يُقْتَلُ: قتل کیے جاتے ہیں اور قتل	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ کی راہ میں

کیے جائیں گے

اَمْوَاتٌ : (کہ وہ لوگ) مردہ ہیں بَلْ : بلکہ

اَحْیَآءٌ : (وہ لوگ) زندہ ہیں وَّلٰکِنْ : اور لیکن

لَّا تَشْعُرُوْنَ : تم لوگ شعور نہیں رکھتے اور نہ رکھو گے

نوٹ (۱) : شہداء کے بہت سے درجے ہیں۔ ان میں سب سے بلند درجہ اُن لوگوں کا ہے جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ بات سمجھ لیں کہ اس آیت میں جو ہدایت ہے وہ مقتول فی سبیل اللہ کے لیے ہے۔ جب معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ زندہ ہیں تو ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ (۱) کہاں زندہ ہیں اور (۲) ان کی زندگی کی کیفیت کیا ہے؟ اس آیت میں پہلے سوال کا جواب نہیں ہے' البتہ آگے چل کر سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۹ میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے ربّ کے پاس زندہ ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ ہم لوگ ان کی زندگی کا شعور حاصل نہیں کر سکتے۔

آیت ۱۵۵

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

ج و ع

جَاعَ (ن) جَوْعًا : بھوکا ہونا۔ ﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝﴾ (طٰہٰ) ''بیشک تیرے لیے ہے کہ تو بھوکا نہیں ہوگا اس میں اور نہ ننگا۔''

جُوْعٌ (اسم ذات) : بھوک۔ ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۝﴾ (قریش:۴) ''جو کھانا دیتا ہے ان کو بھوک میں۔''

ن ق ص

نَقَصَ (ن) نَقْصًا : کمی کرنا' گھٹانا۔ ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ﴾ (ق:۴) ''ہمیں علم ہے اس کا جو گھٹاتی ہے زمین ان میں سے۔''

اُنْقُصْ (فعل امر) : تو کمی کر' تو گھٹا۔ ﴿اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝﴾ (المزمل) ''یا آپ گھٹائیں اس میں سے تھوڑا سا۔''

مَنْقُوْصٌ (اسم المفعول) : کمی کیا ہوا' گھٹایا ہوا۔ ﴿وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ

مَنْقُوْصٍ ﴿۱۱۱﴾ (ھود) ''اور بے شک ہم پورا پورا دینے والے ہیں ان کو ان کا حصہ بغیر کوئی کمی کیا ہوا۔''

نَقْصٌ (اسم ذات): کمی، گھاٹا۔ (آیت زیر مطالعہ)

ترکیب: ''واوٗ'' استیناف۔ ''لام'' موطئہ للقسم۔ ''نَبْلُوَنَّ''، فعل مضارع مبنی علی الفتح۔ اس کا فاعل ''نَحْنُ''، ضمیر مستتر وجوباً ''کُمْ''، ضمیر مفعول بہ۔ ''بِشَیْءٍ'' میں ''بِ'' حرف جار ''شَیْءٍ'' موصوف ''مِنَ الْخَوْفِ'' میں ''مِنْ'' حرفِ جار ''الْخَوْفِ''، معطوف علیہ ''وَالْجُوْعِ'' میں ''واوٗ'' حرفِ عطف ''الْجُوْعِ'' معطوف۔ معطوف علیہ اور معطوف مل کر مجرور۔ جار مجرور مل کر متعلق ''کَائِنٌ''۔ ''کَائِنٌ'' اپنے متعلق سے مل کر ''شَیْءٍ'' کی صفت۔ موصوف صفت مل کر معطوف علیہ۔ ''واوٗ'' حرفِ عطف ''نَقْصٍ'' موصوف ''مِنَ الْاَمْوَالِ'' میں ''مِنْ'' حرفِ جار ''الْاَمْوَالِ'' معطوف علیہ ''واوٗ'' حرفِ عطف۔ ''الْاَنْفُسِ'' معطوف اول ''واوٗ'' حرفِ عطف ''الثَّمَرَاتِ'' معطوفِ ثانی۔ معطوف علیہ اپنے دونوں معطوفوں سے مل کر ''مِنْ'' حرف جار کا مجرور۔ جار مجرور مل کر متعلق ''کَائِنٌ''۔ ''کَائِنٌ'' اپنے متعلق سے مل کر صفت ہے ''نَقْصٍ'' کی۔ ''نَقْصٍ'' اپنی صفت سے مل کر معطوف۔ معطوف علیہ اپنے معطوف سے مل کر باء حرف جار کا مجرور۔ جار مجرور متعلق ''نَبْلُوَنَّ''۔ ''نَبْلُوَنَّ''، فعل + فاعل + مفعول + متعلق جملہ فعلیہ ہو کر معطوف علیہ۔ ''وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ'' میں ''واوٗ'' حرفِ عطف ''بَشِّرْ''، فعل امر۔ اس کا فاعل ضمیر مستتر ''اَنْتَ''۔ ''الصّٰبِرِیْنَ'' موصوف۔

ترجمہ

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ : اور ہم لازماً	بِشَیْءٍ : کسی چیز سے
آزمائیں گے تم لوگوں کو	
مِّنَ الْخَوْفِ : خوف میں سے	وَالْجُوْعِ : اور بھوک میں سے
وَنَقْصٍ : اور کچھ گھاٹے سے	مِّنَ الْاَمْوَالِ : مالوں میں سے
وَالْاَنْفُسِ : اور جانوں میں سے	وَالثَّمَرٰتِ : اور پھلوں میں سے
وَبَشِّرِ : اور آپ بشارت دیں	الصّٰبِرِیْنَ : ثابت قدم رہنے والوں کو

نوٹ (۱): ''بِشَیْءٍ'' کا لفظی ترجمہ تو یہی بنتا ہے کہ ''کسی چیز سے'' لیکن محاورہ میں اس کا مفہوم ہے ''تھوڑا سا'' یا ''ذرا سا''۔ اس آیت میں یہ لفظ لا کر ہمیں بتا دیا گیا ہے کہ کوئی

آزمائش ہمیں کتنی بھی بڑی معلوم ہو' لیکن دراصل وہ چھوٹی ہی ہوگی۔ ہم لوگوں کو اس کا تجربہ بھی ہے۔ جب کوئی آزمائش گزر جاتی ہے تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنی بڑی آزمائش نہیں تھی جتنا ہم واویلا کر رہے تھے۔ اور جب کوئی نئی آزمائش آتی ہے تو ہم پچھلے تجربے کو بھول جاتے ہیں۔

نوٹ (۲): آزمائش کے ضمن میں پہلی بات یہ نوٹ کرلیں کہ یہ ہر انسان کی ضرورت ہے۔ اس نظام سے اللہ کی کوئی غرض نہیں اٹکی ہوئی ہے۔ اس لیے اس دنیا میں عابد و زاہد' فاسق و فاجر' مؤمن و کافر' غرض ہر قسم کے انسان کو مختلف آزمائشوں سے گزارا جاتا ہے جو مختلف قسم کے انسانوں کی مختلف ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ اس آیت کے سیاق و سباق میں نیکوکار اہل ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ اس لیے اس مقام پر یہ بات سمجھ لیں کہ ایمان کی حالت میں عمل صالح کرنے والے لوگوں کی کون سی ضرورت ان آزمائشوں سے پوری ہوتی ہے۔

ہماری ایک کمزوری یہ ہے کہ ہم کو کتنا بھی انعام و اکرام دے دیا جائے' عام طور پر ہم اس سے مطمئن نہیں ہوتے اور مزید کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ مطالبہ زبانی دعووں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ہماری دوسری کمزوری یہ ہے کہ اگر ہمارے مطالبے کے مطابق ہم کو دے دیا جائے تو ہم پھر بھی مطمئن نہیں ہوتے' کیونکہ ہم دوسرے کی تھالی میں جھانکتے ہیں کہ اس کو اتنا کیوں ملا؟ اور یہ بات طے ہے کہ میدانِ حشر میں ہماری یہ کمزوریاں ختم نہیں ہوں گی بلکہ زیادہ ہو جائیں گی۔

اس کا علاج یہی ہے کہ ہمارے بلند بانگ دعووں کا لپ اسٹک اور پاؤڈر آزمائش کی کڑی دھوپ میں اتار دیا جائے اور ہر ایک کے دعوے کی حقیقت ریکارڈ پر آ جائے۔ اس طرح نیکوکار اہل ایمان میدانِ حشر میں اطمینانِ قلب کی نعمت حاصل کریں گے۔

آیت ۱۵۶

﴿اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾

ترکیب: ''اَلَّذِیْنَ'' اسم موصول۔ ''اِذَا'' حرف شرط ''اَصَابَتْهُمْ'' میں ''هُمْ'' ضمیر مفعول مقدم۔ ''مُّصِیْبَةٌ'' فاعل مؤخر۔ فعل + فاعل + مفعول جملہ فعلیہ ہو کر شرط۔ ''قَالُوْا'' فعل ''واؤ'' ضمیر بارز فاعل ''اِنَّا'' میں ''اِنَّ'' حرف مشبہ بالفعل ''نَا'' ضمیر اسم۔ ''لِلّٰهِ'' جار

مجرور متعلق بمحذوف جملہ اسمیہ معطوف علیہ ''وَاِنَّا'' میں ''واؤ'' حرف عطف ''اِنَّ'' حرف مشبہ بالفعل ''نَا'' ضمیر اس کا اسم ''رَاجِعُوْنَ'' خبر ''اِلَیْہِ'' ''رَاجِعُوْنَ'' سے متعلق۔ یہ جملہ اسمیہ ہو کر معطوف۔ معطوف + معطوف علیہ مقولہ ''قَالُوْا'' کا۔ ''قَالُوْا'' فعل + فاعل + مقولہ مل کر جملہ فعلیہ ہو کر جزا۔ شرط + جزا مل کر صلہ موصول ''الَّذِیْنَ'' کا۔ موصول + صلہ صفت ''الصّٰبِرِیْنَ'' کا۔ موصوف + صفت مفعول ''بَشِّرْ'' کا۔ ''بَشِّرْ'' فعل + فاعل + مفعول مل کر جملہ فعلیہ ہو کر عطف ہے ''وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ'' پر۔ ''لَنَبْلُوَنَّکُمْ'' اپنے معطوف سے مل کر جواب قسم ہے فعل محذوف قسم کا۔ فعل قسم محذوف + جواب قسم جملہ قسمیہ ہے۔

ترجمہ

الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو	اِذَا : جب بھی
اَصَابَتْھُمْ : پہنچتی ہے ان کو	مُّصِیْبَۃٌ : کوئی مصیبت
قَالُوْا : تو وہ لوگ کہتے ہیں	اِنَّا : بیشک ہم
لِلّٰہِ : اللہ کے لیے ہیں	وَاِنَّا : اور یقیناً ہم
اِلَیْہِ : اس کی طرف ہی	رٰجِعُوْنَ : لوٹنے والے ہیں

آیت ۱۵۷

﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ ۟ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ۝﴾

ترکیب : ''صلوٰۃ'' سے مراد ہے نماز' دعا' رحمت۔ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ ''صلوٰۃ'' بغیر اضافت ہے واؤ کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ یہ لفظ کے مفخم ہونے کی بنا پر ہے۔ جیسے زکوٰۃ۔ صلوٰۃ ''تَصْلِیَۃ'' سے اسم ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا کرنے' برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ اِلٰی طَعَامٍ فَلْیُجِبْ وَاِنْ کَانَ صَائِمًا فَلْیُصَلِّ (اَیْ فَلْیَدْعُ)۔ نیز ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَصَلِّ عَلَیْھِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ ۭ﴾ (التوبۃ: ۱۰۳) ''اور اُن کے حق میں دعائے رحمت کرو' کیونکہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی''۔ ''فَصَلِّ عَلَیْھِمْ'' اَیْ اُدْعُ لَھُمْ۔ اللہ کی طرف سے مسلمانوں پر صلوٰۃ کا مطلب ان کو سراہنا ہے۔ ﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ﴾ (آیت زیر

مطالعہ) فرشتوں کی طرف سے ''صَلٰوۃ'' کا معنی وہی ہے جو آدمیوں کی طرف سے صلوٰۃ کا ہے (دعا اور مغفرت)۔ اور وہ صلوٰۃ کہ جو عبادت مخصوصہ ہے (بمعنی نماز) اس کی اصل بھی دعا ہی ہے' جس طرح کہ کسی شے کو بعض اجزاء کے نام پر موسوم کر دیتے ہیں اسی طرح یہ عبادت یعنی نماز بھی دعا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے صلوٰۃ سے موسوم ہوئی۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ صلوٰۃ کی اصل ''صلا'' ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ''صَلَّ الرَّجُلُ'' کے معنی ہیں کہ اس شخص نے اس عبادت کے ذریعہ ''صلا'' کو جو کہ حق تعالیٰ کی سلگائی ہوئی آگ ہے' اپنے اوپر سے دفع کر دیا۔ نیز عبادت خانہ کو بھی صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کنائس یہود (یہودیوں کے عبادت خانے) صلوات سے موسوم ہیں۔ ﴿لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ﴾ (الحج: ٤٠)

تنبیہ: ہر وہ مقام کہ جہاں حق تعالیٰ نے فعل صلوٰۃ پر مدح فرمائی ہے یا اس پر رغبت دلائی ہے وہاں لفظ ''اِقَامَة'' مذکور ہے۔ مثلاً: ''اَلْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ' اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ' اَقَامُوا الصَّلٰوةَ'' جبکہ منافقین کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝﴾ (الماعون) اور: ﴿لَا يَاْتُوْنَ الصَّلَاةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ (التوبۃ:۵۴)

ترجمہ

اُولٰٓئِكَ: وہ لوگ ہیں	عَلَيْهِمْ: جن پر ہیں
صَلَوٰتٌ: عنایتیں	مِّنْ رَّبِّهِمْ: ان کے ربّ (کی جانب) سے
وَرَحْمَةٌ: اور رحمت	وَاُولٰٓئِكَ: اور وہ لوگ
هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ: ہی ہدایت پانے والے ہیں	

آیت ۱۵۸

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

جون ح

جَنَحَ (ض) جُنُوْحًا: کشتی کا کسی جانب جھک جانا' کسی کا کسی طرف مائل ہونا۔ ﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ (الانفال:۶۱) ''اور اگر وہ لوگ مائل ہوں صلح کے لیے تو آپ بھی مائل ہوں اس کے لیے۔''

اِجْنَحْ (فعل امر) : تو جھک' تو مائل ہو۔ (آیت مذکورہ بالا)

جَنَاحٌ (ج) اَجْنِحَةٌ : اسم ذات ہے۔ کسی چیز کا کوئی جانب' انسان کا پہلو' بغل' پرندوں کے پر۔ ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الحجر) ''اور آپ جھکائیں اپنا پہلو مؤمنوں کے لیے۔'' ﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ﴾ (طٰہٰ:۲۲) ''اور آپ ملالیں اپنا ہاتھ اپنی بغل کی طرف۔'' ﴿وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (الانعام:۳۸) ''اور نہ کوئی اڑنے والا جو اڑتا ہے اپنے دونوں پروں سے۔'' ﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ﴾ (فاطر:۱) ''فرشتوں کو بنانے والا رسول' جن کے پر ہیں۔''

جُنَاحٌ (اسم ذات) : کسی غلط جانب جھکاؤ' گناہ۔ (آیت زیر مطالعہ)

طوع

طَاعَ (ف۔ن) طَوْعًا: تابع فرمان ہونا' فرمانبردار ہونا۔

طَائِعٌ : تابع فرمان بنانے والا۔ ﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ (حٰمٓ السجدۃ) ''تو اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) کہا اس سے (یعنی آسمان سے) اور زمین سے کہ تم دونوں آؤ مطیع ہوتے ہوئے یا کراہیت کرتے ہوئے۔ ان دونوں نے کہا ہم آئے مطیع ہونے والے ہوتے ہوئے۔''

اَطَاعَ (افعال) اِطَاعَةٌ اور طَاعَةٌ : کسی کی فرمانبرداری کرنا' اطاعت کرنا۔ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ﴾ (النساء:۸۱) ''اور وہ لوگ کہتے ہیں فرمانبرداری کرنا ہے۔'' ﴿يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا﴾ (الاحزاب) ''وہ لوگ کہیں گے اے کاش! ہم اطاعت کرتے اللہ کی اور ہم اطاعت کرتے ان رسول کی۔''

اَطِعْ (ج) اَطِيْعُوْا (فعل امر) : تو اطاعت کر' ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ (آل عمران:۳۲) ''تم لوگ اطاعت کرو اللہ کی اور ان رسول کی۔''

لَا تُطِعْ (فعل نہی) : تو اطاعت مت کر' تو کہنا مت مان۔ ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (الکہف:۲۸) ''اور تو کہنا مت مان اس کا ہم نے غافل کیا جس کے دل کو اپنی یاد سے۔''

مُطَاعٌ (اسم المفعول) : اطاعت کیا ہوا' بات مانا ہوا۔ ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۙ﴾ (التکویر) ''قوت والا' عرش والے کے پاس رہنے والا' مانا جانے والا' وہی امانت والا۔''

طَوَّعَ (تفعیل) تَطْوِیْعًا : کسی کو مطیع فرمان بنانا' کسی کام کے لیے راضی کرنا۔ ﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ﴾ (المائدۃ:۳۰) ''پس راضی کیا اُس کو اُس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر۔''

تَطَوَّعَ (تفعل) تَطَوُّعًا : بتکلف فرمانبرداری کرنا۔اس بنیادی مفہوم کے ساتھ پھر اصطلاحاً نفلی عبادات کرنے کے لیے آتا ہے۔(آیت زیر مطالعہ)

مُطَوِّعٌ (اسم الفاعل) : نفلی عبادت کرنا والا۔ ﴿اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ﴾ (التوبۃ:۷۹) ''وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں نفلی عبادت کرنے والوں کو''۔

اِسْتَطَاعَ (استفعال) اِسْتِطَاعَةً :فرمانبرداری کرنے کے لائق ہونا' صلاحیت یا قدرت رکھنا۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن:۱۶) ''پس تقویٰ اختیار کرو اللہ کا اتنا جتنی تمہاری صلاحیت ہو۔''

ش ک ر

شَکَرَ (ن) شُکْرًا اور شُکُوْرًا : کسی نعمت و بھلائی کا اعتراف کرنا' احسان ماننا' شکر کرنا۔ ﴿وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِهٖ﴾ (النمل:۴۰) ''اور جس نے شکر کیا تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ شکر کرتا ہے اپنے آپ کے لیے۔''

اُشْکُرْ (فعل امر) : تو احسان مان' تو شکر کر۔ ﴿اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ﴾ (لقمٰن:۱۴) ''کہ تو احسان مان میرا اور اپنے والدین کا۔''

شَاکِرٌ (اسم الفاعل) : شکر کرنے والا۔ اس کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے قدر کرنے والا۔ (آیت زیر مطالعہ) اور :﴿شَاکِرًا لِّاَنْعُمِهٖ﴾ (النحل:۱۲۱) ''شکر کرنے والا اس کے احسانوں کا۔''

مَشْکُوْرٌ (اسم المفعول) : شکر کیا ہوا' قدر کیا ہوا۔ ﴿فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل) ''تو وہ لوگ ہیں جن کی بھاگ دوڑ قدر کی ہوئی ہے۔''

شَکُوْرٌ: فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بے انتہا شکر کرنے والا۔ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ﴾ (ابراہیم) ''بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر ایک بار بار صبر کرنے والے' بے انتہا شکر کرنے والے کے لیے۔'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ (الشوریٰ) ''بے شک اللہ بے انتہا بخشنے والا' بے انتہا قدر کرنے والا ہے۔''

ترکیب :صَفا ایک مشہور پہاڑی کا نام ہے جو مکہ معظمہ میں مسجد حرام کے پاس

ہے۔امام بغوی لکھتے ہیں: صَفَا' صَفَاۃٌ کی جمع ہے۔''صَفَاۃٌ''اس سخت چٹان کو کہتے ہیں جو صاف اور ہموار ہو۔''صَفَاۃٌ''اور''صَفَا''جیسے''حَصَاۃٌ''اور''حَصٰی''اور''نَوَاۃٌ''اور ''نَوًی''۔مَروۃ نرم پتھر کو کہتے ہیں اور اس کی جمع ''مَرَوَاتٌ''آتی ہے اور جمع کثرت ''مُرَوٌ''ہے۔جیسے''ثَمَرَۃٌ''کی جمع''ثَمَرَاتٌ''اور''ثُمُرٌ''ہے۔ (معالم التنزیل ۱/۱۱۱)

''اِنَّ''حرف مشبہ بالفعل''الصَّفَا''معطوف علیہ''واوَ''حرف عطف''الْمَرْوَۃَ'' معطوف۔معطوف اور معطوف علیہ مل کر''اِنَّ''کا اسم۔''مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ''جار مجرور مل کر متعلق''کَائِنَان''خبر۔''فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ''میں''فاء''استیناف''مَنْ''اسم شرط جازم مبتدا''حَجَّ''فعل ماضی۔اس میں ضمیر''ھُوَ''اس کا فاعل''الْبَیْتَ''مفعول۔فعل + فاعل + مفعول جملہ فعلیہ ہو کر معطوف علیہ۔''اَوْ''حرف عطف''اعْتَمَرَ''فعل ماضی۔اس میں ضمیر ''ھُوَ''اس کا فاعل۔فعل + فاعل جملہ فعلیہ ہو کر معطوف۔معطوف + مطعوف علیہ فعل شرط۔ ''فَلَا جُنَاحَ''میں''فا''جزائیہ''لا''نفی جنس''جُنَاحَ''اس کا اسم''عَلَیْہِ''جار مجرور متعلق ''وَاقِعٌ''خبر ہے۔''اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا''میں''اَنْ''حرف مصدریہ''یَطَّوَّفَ''فعل۔ضمیر ''ھُوَ''اس کا فاعل''بِھِمَا''جار مجرور اس کا متعلق۔یہ جملہ فعلیہ بتاویل مصدر ہو کر منصوب ''بنزع الخافض''۔تقدیر عبارت یوں ہے:''فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ فِیْ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا''۔ ''فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ''سے لے کر''اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا''تک جملہ جزاء ہے''حَجَّ الْبَیْتَ''کے لیے۔شرط اور جزا مل کر خبر ہے''مَنْ''مبتدا کی۔''واوَ''حرف عطف''مَنْ''اسم شرط جازم مبتدا''تَطَوَّعَ''فعل۔ضمیر''ھُوَ''اس کا فاعل''خَیْرًا''صفت ہے موصوف محذوف ''تَطَوُّعًا''کی۔موصوف صفت مفعول مطلق۔فعل + فاعل + مفعول مطلق جملہ فعلیہ ہو کر شرط۔''فاء''جزائیہ''اِنَّ''حرف مشبہ بالفعل۔لفظ''اللّٰہ''اس کا اسم''شَاکِرٌ عَلِیْمٌ''اس کی خبر۔یہ جملہ اسمیہ ہو کر جزاء۔شرط اور جزا مل کر جملہ شرطیہ ہو کر ''مَنْ''مبتدا کی خبر ہے۔

ترجمہ

اِنَّ: بیشک	الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ: صفا اور مروہ ہیں
مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ: اللہ کا شعور حاصل کرنے کی علامتوں میں سے	فَمَنْ: پس جس نے
حَجَّ الْبَیْتَ: زیارت کی اس گھر کی	اَوِ اعْتَمَرَ: یا عمرہ کیا

فَلَا جُنَاحَ : تو کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں ہے
عَلَيْهِ : اس پر
اَنْ يَّطَّوَّفَ : کہ وہ بتکلف چکر لگائے
بِهِمَا : ان دونوں میں
وَمَنْ : اور جس نے
تَطَوَّعَ : نفلاً کی
خَيْرًا : کوئی بھلائی
فَاِنَّ اللّٰهَ : تو یقیناً اللہ
شَاكِرٌ : قدردان ہے
عَلِيْمٌ : جاننے والا ہے

نوٹ (۱) : زمانۂ جاہلیت میں صفا اور مروہ پر مورتیاں رکھی ہوتی تھیں اور کفار انہی کی پوجا کرنے کے لیے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے۔ اس وجہ سے کچھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو شبہ تھا کہ کہیں اس میں کوئی گناہ نہ ہو۔ اس آیت میں اس شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے' کیونکہ یہ بی بی ہاجرہ کا عمل تھا اور سنت ابراہیمیؑ ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک حج یا عمرہ میں سعی کرنا مستحب ہے' امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے' جبکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ فرض ہے۔ (معارف القرآن)

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و بانی تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد
کے پانچ خطبات جو سالانہ محاضرات ۱۹۹۱ء میں دیئے گئے
حقیقت ایمان
تسوید و ترتیب: مولانا ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور
﴿اہم موضوعات﴾
■ ایمان کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم ■ ایمان کا موضوع
■ قانونی اور حقیقی ایمان کافر فرق اور ان کے ضمن میں کلامی مباحث
■ ایمان و عمل کا باہمی تعلق ■ ایمان اور نفاق ■ ایمان حقیقی کے سرچشمے
اشاعت خاص: 90 روپے اشاعت عام: 50 روپے

سلسلۂ نباتات قرآن (قسط 8)

ضَرِیْع

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

اس خاردار درخت یا گھاس کا ذکر سورۃ الغاشیہ کی آیات ۶ اور ۷ میں آیا ہے:

﴿لَیْسَ لَھُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ۝ لَّا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ ۝﴾

''خاردار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا اُن کے لئے نہ ہوگا' جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے۔''

قرآنِ مجید میں جہنم کے لوگوں کے کھانے کے لیے کہیں فرمایا گیا ہے کہ ''زَقُّوم'' دیا جائے گا' کہیں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے لیے غسلین (زخموں کے دھوون) کے سوا کوئی کھانا نہ ہوگا' اور ان آیات میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ انہیں خاردار سوکھی گھاس کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملے گا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''ان بیانات میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنم کے بہت سے درجے ہوں گے' جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب اُن کو دیے جائیں گے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زقوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو ان کو غسلین ملے گا۔ اُس سے بھی بچنا چاہیں گے تو خاردار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے۔ غرض کوئی مرغوب غذا بہرحال انہیں نصیب نہ ہوگی۔''

یہ تشریح بالکل واضح ہے اور تمام مفسرین کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ مفتی محمد شفیعؒ نے ''معارف القرآن'' میں مزید وضاحت کرتے ہوئے قرطبیؒ' عکرمہ اور مجاہد کے حوالے سے لکھا ہے:

''اہل جہنم کو کھانے کے لئے ضَرِیع کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ ضریع دُنیا میں ایک خاص قسم کی خاردار گھاس ہے جو زمین پر پھیلتی ہے۔ کوئی جانور اس کے پاس نہیں جاتا' بدبودار

زہریلی کانٹوں والی ہے''۔

''یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ گھاس' درخت تو آگ سے جل جانے والی چیزیں ہیں' جہنم میں یہ کیسے رہیں گی؟ کیونکہ جس خالق و مالک نے ان کو دنیا میں پانی اور ہوا سے پالا ہے' اس کو یہ بھی قدرت ہے کہ جہنم میں ان درختوں کی غذا آگ ہی بنا دے' وہ اسی سے پھلیں پھولیں''۔

مولانا صاحب مزید لکھتے ہیں:

''قرآن میں اہل جہنم کی غذا کے بارے میں مختلف چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ اس آیت میں ضَرِیع اُن کی غذا بتلائی ہے۔ دوسری جگہ زقوم اور تیسری جگہ غِسلین' تو اس آیت میں جو حَصَر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اہل جہنم کو کوئی غذا بجز ضریع کے نہ دی جائے گی' یہ حصر بمقابلہ اس غذا کے ہے جو کھانے کے لائق' خوشگوار' جزو بدن بننے والی ہو اور ضریع بطور مثال کے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل جہنم کو کھانے کے لائق کوئی غذا نہیں ملے گی' بلکہ ضریع جیسی تکلیف دہ مضر چیزیں دی جائیں گی' اس لیے ضریع میں حصر مقصود نہیں' بلکہ زقوم اور غِسلین بھی ضریع میں شامل ہیں۔ قرطبی نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ جہنم کے مختلف طبقات میں ان کی غذائیں مختلف ہوں' کہیں ضریع' کہیں زقوم' کہیں غِسلین''۔

''بعض کفار مکہ نے جب یہ آیت سنی تو کہنے لگے کہ ہمارے اونٹ تو ضریع کھا کر خوب فربہ ہو جاتے ہیں' ان کے جواب میں اگلی آیت میں فرمایا کہ جہنم کے ضریع کو دنیا کے ضریع پر قیاس نہ کرو۔ وہاں کے ضریع سے نہ فربہی پیدا ہوگی اور نہ بھوک سے نجات ملے گی''۔

ہم نے ''زَقُّوم'' (تھوہر) کی وضاحت میں جو مضمون لکھا تھا اور جو ''سلسلۂ نباتاتِ قرآن'' کے تحت ''حکمتِ قرآن'' کے شمارہ بابت فروری ۲۰۰۵ء میں شاملِ اشاعت تھا' وہی وضاحت ''ضریع'' پر بھی صادق آتی ہے۔

سلسلۂ نباتاتِ قرآن کے تحت ''حکمت قرآن'' بابت جون ۲۰۰۵ء میں ''سِدرہ'' کے بارے میں جو مضمون شائع ہوا تھا اس پر ایک مخلصانہ تنقیدی خط پروفیسر خورشید عالم صاحب کا موصول ہوا ہے جس سے ''سِدرہ'' درخت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر صاحب کا خط یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

(باقی صفحہ 44 پر)

قرآن کا اندازِ خطاب اور اس کی اقسام (۱)

مصنف: الامام بدرالدین محمد بن عبداللہ الزرکشی
ترجمہ وتلخیص: حافظ محمد زبیر ☆

یہ مضمون علوم القرآن کی معروف کتاب ''البرہان'' سے لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں علامہ زرکشیؒ نے قرآن کے اندازِ خطاب پر بحث کی ہے کہ بعض اوقات قرآن کا خطاب خاص ہوتا ہے لیکن مراد عموم ہوتا ہے اور بعض اوقات خطاب میں عموم ہوتا ہے لیکن معنی میں اختصاص ہوتا ہے۔ بہرحال قرآن کے ترجمہ وتفسیر میں اس مضمون کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ایک لحاظ سے اس مضمون میں وہ اصول تفسیر بیان کیے گئے ہیں جو کہ قرآن کے اندازِ خطاب اور مخاطبات سے بحث کرتے ہیں۔

قرآن میں خطاب کے مختلف انداز ہیں:

① خطاب بھی عام ہو اور مراد بھی عام ہو

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) ﴿إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (المجادلة)

''بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

(۲) ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا﴾ (یونس: ٤٤)

''بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔''

(۳) ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ (الکھف)

''اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

(۴) ﴿اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ (الروم: ٤٠)

''اللہ وہ ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا' پھر تم کو رزق دیا' پھر تم کو مارے گا' پھر زندہ کرے گا۔''

☆ شعبۂ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

(۵) ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ (المؤمن:٦٧)
''اللہ وہ ذات ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفے سے۔''
(٦) ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ (المؤمن:٦٤)
''اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا۔''
(٧) ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ﴾ (الانفطار)
''اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے کریم ربّ کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا؟''

② خطاب بھی خاص ہو اور مراد بھی خاص ہو

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
(۱) ﴿اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ﴾ (آل عمران: ١٠٦)
''کیا تم نے کفر کیا ایمان لانے کے بعد؟''
(۲) ﴿هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ﴾ (التوبۃ: ٣٥)
''یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنی جانوں کے لیے جمع کیا تھا۔''
(۳) ﴿ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ﴾ (الدُّخان)
''چکھ (عذاب کو)' بے شک تو بڑا قوی اور باعزت تھا۔''
(۴) ﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدۃ:٦٧)
''اے رسول (ﷺ)! پہنچا دیں وہ جو کہ آپ کی طرف آپ کے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا۔''
(۵) ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾ (الاحزاب:٣٧)
''پس جب زید (رضی اللہ عنہ) نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے آپ کا نکاح اس (زینب رضی اللہ عنہا) سے کر دیا۔''
اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات ہیں۔

③ خطاب خاص ہو جب کہ مراد عام ہو

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
(۱) ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ.....﴾ (الطلاق:١)
''اے نبی (ﷺ)! جب تم عورتوں کو طلاق دو.....''
خطاب کی ابتدا رسول اللہ ﷺ سے ہوئی لیکن مراد ہر وہ شخص ہے جو کہ طلاق کا حق رکھتا ہے۔

(۲) ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۡ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ﴾ (الاحزاب: ۵۰)

''اے نبی (ﷺ)! بے شک ہم نے آپؐ کے لیے آپؐ کی ان بیویوں کو حلال کر دیا ہے جن کا حق مہر آپؐ نے ادا کر دیا ہو اور آپؐ کی وہ لونڈیاں جو اللہ نے (مال غنیمت کے طور پر) آپؐ کے ہاتھ لگوا دیں اور آپؐ کے چچا کی بیٹیاں اور آپؐ کی پھوپھی کی بیٹیاں اور آپؐ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپؐ کی خالہ کی بیٹیاں جنہوں نے آپؐ کے ساتھ ہجرت بھی کی' اور مؤمن عورت اگر وہ اپنے آپ کو آپؐ کے لیے ہبہ کر دے' اگر آپؐ اس سے نکاح کرنا چاہیں۔ یہ (رعایت) خالص آپؐ کے لیے ہے اہل ایمان کے علاوہ۔''

ابوبکر الصیرفی کہتے ہیں کہ خطاب کی ابتدا آپؐ سے ہوئی' لیکن جب ہبہ کے بارے میں اللہ کا یہ ارشاد ہوا کہ ''خَالِصَةً لَّكَ'' (یہ صرف آپؐ کے لیے ہے) تو یہ بات معلوم ہوئی کہ ماقبل حکم آپؐ اور آپؐ کے غیر دونوں کو شامل ہے۔

(۳) ﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ﴾ (النساء: ۱۰۲)

''اور جب آپؐ ان کے درمیان ہوں تو اُن کے لیے نماز قائم کریں۔''

امام ابو یوسفؒ نے اس آیت کے ظاہر سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ صلاۃ الخوف صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص ہے' جبکہ جمہور علماء کا موقف اس کے برعکس ہے۔ ان کے نزدیک ''فِيْهِمْ'' بطور شرط نہیں ہے' بلکہ یہاں پر صفت حال بن رہا ہے۔ خطاب میں اصل یہ ہے کہ وہ معین کو ہوتا ہے' اور بعض اوقات خطاب غیر معین کو بھی ہوتا ہے' تاکہ عموم کا فائدہ ہو۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۴) ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ (البقرۃ: ۲۵)

''اور آپؐ خوشخبری دیں ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے کہ اُن کے لیے باغات ہیں۔''

④ خطاب عام ہو جبکہ مراد خاص ہو

اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ قرآن میں واقع ہوا ہے یا نہیں۔ بعض علماء اس کا انکار کرتے ہیں' کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ ایسی دلیل جو تخصیص کا موجب ہو وہ

استثنائے متصل کے قائم مقام ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ (العنکبوت:۱٤)

''پس وہ (نوحؑ) ان کے درمیان رہے ہزار سال' مگر پچاس سال (کم)۔''

اب یہاں عموم کے بعد تخصیص فوراً آئی ہے' لیکن یہ استثناء ہے۔ جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۲) ﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ﴾ (آل عمران:۱۷۳)

''وہ لوگ (کہ) جن کو لوگوں نے کہا بے شک لوگ تمہارے خلاف جمع ہو چکے ہیں۔''

یہاں پر دونوں جگہ'' النَّاسُ '' کا لفظ عام ہے اور اس کی عمومیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تمام لوگ اس کے تحت داخل ہوں' جبکہ یہاں بعض افراد مراد ہیں' کیونکہ قائلین ان میں سے نہیں ہیں جن سے کہا گیا ہے۔ پہلے'' النَّاسُ '' سے مراد نعیم بن سعید الثقفی ہے جبکہ دوسرے'' النَّاسُ '' سے مراد ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں۔

(۳) ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ﴾ (البقرۃ:۱۳)

''اور جب ان سے کہا گیا کہ تم ایمان لاؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے۔''

یہاں'' النَّاسُ '' سے مراد عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں۔

(۴) ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ﴾ (الحُجرات:٤)

''بے شک جو لوگ آپؐ کو پکارتے ہیں گھروں کے پیچھے سے۔''

ضحاک کہتے ہیں یہاں'' اقرع بن حابس'' مراد ہے۔

(۵) ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ﴾ (النساء:۱)

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔''

اس خطاب میں بچے اور مجنون شامل نہیں ہیں۔ پھر تخصیص بعض اوقات آیت کے آخر میں آتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(٦) ﴿وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (النساء:٤)

''اور دے دو عورتوں کو اُن کے حق مہر خوش دلی سے۔''

یہ آیت مبارکہ عام ہے۔ یہ بالغ و چھوٹی' عقل مند و مجنون تمام عورتوں کو شامل ہے۔ پھر آیت کے آخر میں تخصیص کرتے ہوئے فرمایا:

(۔) ﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا﴾ (النساء:٤)

''البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں.....''

اس حکم کو بالغ عقل مند عورت کے لیے خاص کیا' کیونکہ ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں ان کے عفو کو لغو سمجھا جائے گا۔

(۸) اسی طرح:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ﴾ (البقرۃ:۲۲۸)

''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو روکے رکھیں۔''

یہ آیت مطلقہ بائنہ اور رجعیہ دونوں کو عام ہے۔

پھر آگے جا کر اس آیت مبارکہ کو صرف مطلقہ رجعیہ کے لیے خاص کر دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۹) ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾ (البقرۃ:۲۲۸)

''اور اُن کے شوہر اس مدت کے اندر اندر اُن کو لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

یہ آیت مطلقہ رجعیہ کے بارے میں ہے' کیونکہ مطلقہ بائنہ کو نہیں لوٹایا جاتا۔ اور بعض اوقات تخصیص کا ذکر آیت کے شروع میں ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱۰) ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا﴾ (البقرۃ:۲۲۹)

''اور تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے ان کو (بیویوں کو) دیا ہو اُس میں سے کچھ واپس لو۔''

یہ حکم خاص اس چیز کے لیے ہے جو شوہر نے اپنی بیوی کو دی ہو۔ آگے چل کر فرمایا:

(۱۱) ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ (البقرۃ:۲۲۹)

''پس اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ کر سکیں گے تو ان پر کوئی گناہ نہیں اس (معاوضہ) میں جس کو عورت فدیہ میں دے دے۔''

اور بعض اوقات تخصیص کسی دوسری آیت میں آتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱۲) ﴿وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ﴾ (الانفال:۱۶)

''اور جو کوئی اُس دن ان میں سے اپنی پیٹھ پھیر کر بھاگے گا۔''

یہ آیۂ مبارکہ مقاتلین کے حوالے سے عام ہے چاہے زیادہ ہوں یا کم ہوں۔ اس کے بعد فرمایا:

(۱۳) ﴿اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ﴾ (الانفال:٦٥)

''اگر تم میں بیس (۲۰) صبر کرنے والے ہوں وہ دوسو پر غالب آ جائیں گے۔''

یعنی ایک اور دس کا تناسب قائم کر دیا۔

(۱۴) ﴿حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ﴾ (المائدة:٣)

''تمہارے اوپر ہر قسم کا مردار حرام کر دیا گیا ہے۔''

یہ آیت ہر قسم کے مردار کو شامل ہے۔ پھر اس آیت کو ایک دوسری آیت کے ذریعہ خاص کیا:

(۱۵) ﴿فَکُلُوْا مِمَّا اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ﴾ (المائدة:٤)

''پس تم کھالو اس میں سے جس کو وہ (شکاری جانور) روک رکھیں تمہارے لیے۔''

اس آیت کے ذریعہ اس شکار کو جائز قرار دیا جو کہ سکھائے ہوئے شکاری جانور کے مُنہ میں مر جائے۔ ایک اور آیت میں اس کی تخصیص آئی ہے:

(۱۶) ﴿اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ﴾ (المائدة:٩٦)

''تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے۔''

اس کی تقدیر عبارت یہ ہے: ''وَاِنْ کَانَتْ مَیْتَةً'' یعنی تمہارے لیے سمندر کا شکار حلال کیا گیا ہے اگرچہ مردہ ہی کیوں نہ ہو۔ بس اس آیت کے ذریعے سے اوپر والی آیت کے عموم میں تخصیص پیدا کر دی گئی۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱۷) ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ.....﴾ (النور:٢٧)

''اے اہل ایمان! اپنے گھروں کے علاوہ کسی گھر میں داخل نہ ہو۔''

(۱۸) ﴿لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّکُمْ﴾ (النور:٢٩)

''تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے اگر تم اُن گھروں میں داخل ہو جن میں کسی کی رہائش نہ ہو اور اس میں تمہارے لیے نفع اٹھانا ہو۔''

(۱۹) ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ.....﴾ (البقرة:١٧٣)

''اس نے تو تم پر یہی حرام کیا ہے مردار اور خون.....''

دوسری آیت میں فرمایا:

(۲۰) ﴿اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا﴾ (الانعام:١٤٥)

''سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو۔''

یعنی جگر اور تلی اس میں شامل نہیں ہیں اور حلال ہیں۔ یہ آیت جو کہ خاص ہے' سورۃ الانعام میں ہے جو کہ مکی سورت ہے' جبکہ اس کا عام حکم سورۃ المائدۃ میں ہے جو کہ مدنی ہے۔ لہٰذا خاص' عام پر زمانی اعتبار سے مقدم ہوا۔ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق اعتبار خاص آیت ہی کے حکم کا ہوگا چاہے وہ زمانی اعتبار سے مقدم ہو یا مؤخر ہو۔

(۲۱) ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ (النساء: ۲۰)

''اور تم ان میں سے کسی ایک کو ڈھیروں (مال) حق مہر کے طور پر دے دو تو اس سے کچھ بھی واپس نہ لو۔''

اس کی تخصیص درج ذیل آیتِ مبارکہ میں ہے:

(۲۲) ﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ﴾ (النساء: ٤)

''پس اگر وہ خوشی سے تمہارے لیے اپنی طرف سے کچھ معاف کر دیں تو اُس کو کھاؤ۔''

اسی طرح آیہ مبارکہ:

(۲۳) ﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ (النور: ۲)

''زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد اُن میں سے ہر ایک کو سو (۱۰۰) کوڑے لگاؤ۔''

یہ آیت آزاد عورتوں اور لونڈیوں سب کے بارے میں عام ہے۔ پھر اس آیت کو ایک دوسری آیت سے خاص کیا گیا:

(۲۴) ﴿فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (النساء: ۲۵)

''پس ان کے اوپر (لونڈیوں پر) اس سزا کا نصف ہوگا جو کہ آزاد عورتوں کو ہوگی۔''

(۲۵) ﴿لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرۃ: ۲۵۴)

یعنی اُس دن نہ خرید و فروخت ہوگی' نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ کوئی سفارش۔ یہاں پر ''خُلَّةٌ'' عام ہے۔ پھر اس کو خاص کیا گیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۲۶) ﴿اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ (الزخرف)

''دوست اُس دن آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔''

اسی طرح آیت شفاعت میں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت خاص ہے۔ اور اس کی تخصیص حدیث میں ہے۔

⑤ خطاب جنس

یعنی ایسا خطاب جس میں مخاطب جنس ہو۔ جیسا کہ ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ﴾ یہاں لوگوں کی جنس مراد ہے نہ کہ ہر فرد مراد ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ غیر مکلّف کو یہ خطاب نہیں ہے۔ اکثر اوقات یہ خطاب اہل مکہ کو ہوتا تھا۔ اصولیین کا راجح قول یہ ہے کہ اس خطاب کے تحت رسول اللہ ﷺ بھی داخل ہیں۔

قرآن میں دو سورتیں ایسی ہیں جن کے شروع میں ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ﴾ سے خطاب ہے۔ ایک نصف اوّل میں ہے' وہ سورۃ النساء ہے' دوسری نصف ثانی میں ہے' وہ سورۃ الحج ہے۔ پہلی سورت یعنی سورۃ النسا انسانیت کی ابتدا سے بحث کر رہی ہے جبکہ دوسری سورت سورۃ الحج آخرت سے متعلق ہے۔ انسان اس میں اگر غور کرے تو بلاغت کے عجیب عجیب پہلو اس پر واضح ہوں گے۔

امام راغب نے کہا: ''بعض اوقات'' ''النَّاسُ'' سے مراد فضلاء لیا جاتا ہے اور اس سے مراد عام لوگ نہیں ہوتے۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب ''النَّاسُ'' میں انسانیت کے معنی کا اعتبار کیا جائے' اور وہ عقل کا ہونا اور تمام مخصوص قویٰ کا نام ہے' کیونکہ ہر چیز جب اس کا فعل مختص معدوم ہو جائے تو وہ اس نام کی حق دار نہیں رہتی۔ جیسا کہ ''ہاتھ'' ہے۔ اگر یہ اپنے خاص فعل سے محروم ہو جائے تو اس ہاتھ سے مراد چارپائی کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (البقرۃ:۱۳) ''تم ایمان لاؤ ایسے جیسا کہ لوگ ایمان لے کر آئے''۔ یعنی وہ لوگ جن میں انسانیت پائی جاتی ہے' ان کی طرح ایمان لاؤ۔ انسان سے مراد مجرد انسان نہیں ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) ﴿اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ﴾ (النساء:۵۴)

''کیا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں۔''

یعنی وہ انسان جس میں انسانیت پائی جائے چاہے کوئی بھی ہو۔ اور بعض اوقات اس سے مراد نوع بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۲) ﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ (البقرۃ:۲۵۱)

''اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ سے ختم نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔''

⑥ خطاب النوع

جس میں نوع سے خطاب ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ (البقرۃ:۴۰)

''اے اسرائیل کی اولاد!''

یہاں پر ''بنو یعقوب'' مراد ہیں۔

⑦ خطاب العین

(۱) ﴿یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ﴾ (البقرۃ:۳۵)

''اے آدم! تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو۔''

(۲) ﴿یٰنُوْحُ اھْبِطْ بِسَلٰمٍ﴾ (ھود:۴۸)

''اے نوح! سلامتی کے ساتھ اتر جا۔''

(۳) ﴿یٰٓاِبْرٰھِیْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ﴾ (الصّٰفّٰت:۱۰۴، ۱۰۵)

''اے ابراہیم! تو نے (اپنا) خواب سچا کر دکھایا۔''

(۴) ﴿یٰمُوْسٰی﴾ (الاعراف:۱۴۴) ''اے موسیٰ (علیہ السلام)!''

(۵) ﴿یٰعِیْسٰی﴾ (آل عمران:۵۵) ''اے عیسیٰ (علیہ السلام)!''

''یَامُحَمَّدُ'' قرآن میں نہیں آیا' بلکہ اس کی جگہ ''یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ'' اور ''یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ'' آیا ہے۔

⑧ خطاب المدح

یعنی ایسا خطاب جس میں مدح ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے ایمان والو!''

یہ خطاب اُن اہل مدینہ کے لیے ہے جنہوں نے ہجرت کی اور ایمان لے کر آئے۔ یہ خطاب اہل مدینہ کو اہلِ مکہ سے جدا کرنے کے لیے ہے۔ اہل مکہ کو عام طور پر ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' سے خطاب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اہل کفر کو اصل حکم ایمان لانے کا تھا۔ جو اُن میں سے ایمان لے آئے ان کو پھر ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے ذریعہ شریعت کے احکام کی تفصیل بتائی گئی۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۲) ﴿وَتُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (النور:۳۱)

''اور اللہ کے ہاں توبہ کرو سب کے سب اے اہل ایمان!''

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں خطاب ظاہر کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے اور یہاں خطاب منافقین کو ہے جو کہ بظاہر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے جبکہ ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (المائدۃ:۴۱)

''انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اپنے مُنہ سے' حالانکہ ان کے دل ایمان نہ لائے۔''

علامہ زمخشریؒ نے جائز قرار دیا ہے کہ سورۃ المجادلہ میں اس خطاب کو منافقین کے لیے یا اہل ایمان کے لیے خاص کر دیا جائے:

(۳) ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ﴾ (المجادلۃ:۱۲)

''اے اہل ایمان! جب تم اللہ کے رسول سے سرگوشی کرو۔''

''یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ'' اور ''یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ'' کا خطاب بھی اسی نوع کے تحت داخل ہے۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ بعض جگہ ''یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ'' سے خطاب ہے۔ وہاں ''یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ'' سے خطاب مناسب نہ تھا۔ (عموماً ''یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ'' کا خطاب عام جگہ پر ہوتا ہے جبکہ ''یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ'' کا خطاب خاص جگہ پر ہوتا ہے۔)

(۴) ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدۃ:۶۷)

''اے رسول (ﷺ)! آپؐ پہنچا دیں جو آپ کی طرف آپؐ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔''

جبکہ خاص جگہ پر خطاب اس طرح سے فرمایا:

(۵) ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ (التحریم:۱)

''اے نبیؐ! آپ کیوں اس چیز کو حرام قرار دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے حلال کر دی ہے۔''

(۶) ﴿اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الاحزاب:۵۰)

''اگر نبیؐ اس سے نکاح کرنا چاہیں۔ یہ صرف آپؐ کے لیے ہے اہل ایمان کے علاوہ۔''

اسی طرح اس آیہ مبارکہ میں:

(۷) ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (احزاب:۳۲)

''اے نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔''

''یٰنِسَآءَ الرَّسُوْلِ'' نہیں کہا' کیونکہ یہ عام ہے اور ''یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ'' خاص ہے۔ اور بعض اوقات ''یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ'' کا خطاب عام ہوتا ہے لیکن اس کے لیے تعمیم کا کوئی قرینہ ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۸) ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ (الطلاق:۱)

''اے نبیؐ جب تم عورتوں کو طلاق دو۔''

یہاں ''طَلَّقْتَ'' کی بجائے ''طَلَّقْتُمْ'' کہا ہے جو کہ خطاب کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔

⑨ خطاب الذم

یعنی جس خطاب میں کسی کی مذمت کی جائے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ﴾ (التحریم:۷)

''اے کافرو! آج کے دن عذر نہ پیش کرو۔''

(۲) ﴿قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ (الکافرون)

''کہہ دیجیے اے کافرو!''

اہل ایمان سے عام طور پر بلا واسطہ خطاب ہوتا ہے جبکہ کفار کے ساتھ بالواسطہ خطاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۳) ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (الانفال:۳۸)

''آپؐ کہہ دیں ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا۔''

اسی طرح ارشاد ہے:

(۴) ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ (الانفال:۳۹)

''ان سے آپؐ لڑیں یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔''

اہل ایمان کو براہِ راست خطاب فرمایا جبکہ کفار سے خطاب کرنے میں اعراض کیا۔ اسی وجہ سے جب آپؐ کسی قوم سے ناراض ہوتے تو کہتے:

((مَا بَالُ رِجَالٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا؟))

''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسا کرتے ہیں؟''

آپؐ ان سے اعراض کرتے ہوئے ان کو غیب کے انداز میں خطاب فرماتے۔

⑩ خطاب الکرامۃ

یعنی ایسا خطاب جس میں کسی کی عزت و تکریم ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) ﴿وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ (الاعراف:۱۹)

''اور اے آدمؑ! تو اور تیری بیوی جنت میں رہیں۔''

(۲) ﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ﴾ (الحجر:۴۶)

''تم (سب) داخل ہو جاؤ اس (جنت) میں سلامتی کے ساتھ۔''

⑪ خطاب الاھانۃ

کسی کو ذلیل کرنے کے لیے خطاب کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ابلیس کے بارے میں ہے:

(۱) ﴿فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ﴾ (الحجر:۳۴،۳۵)

''بے شک تو مردود ہے اور تیرے اوپر لعنت ہو۔''

اہل جہنم کے بارے میں فرمایا:

(۲) ﴿قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝﴾ (المؤمنون)

''اس میں ذلیل وخوار ہو کر پڑے رہو اور مجھ سے کلام تک نہ کرو۔''

اسی طرح ابلیس کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے:

(۳) ﴿وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ﴾ (الاسراء:٦٤)

''اور ان پر اپنے گھوڑے اور پیادوں کو دوڑا لے۔''

(۴) ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (الاسراء:٦٥)

''بے شک میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔''

⑫ خطاب تہکم

اس سے مراد مخاطب کا مذاق اڑانا ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: تَهَكَّمَ الْبِئْرُ ''کنواں گر گیا''۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) ﴿ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝﴾ (الدُّخان)

''چکھ (عذاب کو) بے شک تو بڑا باعزت اور بزرگ تھا۔''

یہ ابوجہل سے خطاب ہے' کیونکہ اس نے آپؐ سے کہا تھا کہ میں مکہ کے دو پہاڑوں کے درمیان سب سے باعزت اور بزرگی والا ہوں''۔

(۲) ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ (التوبة)

''آپ ان کو خوشخبری دے دیں ایک دردناک عذاب کی۔''

(۳) ﴿وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝﴾ (الواقعة)

''اور اگر وہ جھٹلانے والا گمراہ لوگوں میں سے ہوا تو (ہم) گرم پانی سے' اور اس کو جہنم میں جھونک کر' اس کی مہمان نوازی کریں گے۔''

⑬ واحد لفظ کے ساتھ جمع کو خطاب:

یعنی لفظ واحد ہو لیکن خطاب ایک جماعت کو ہو۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

(۱) ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ﴾ (الانشقاق:٦)

''اے انسان بے شک تو مشقت اٹھا رہا ہے۔''

(۲) ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (العصر:۲،۳)

''بے شک انسان البتہ خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے۔''

یہاں استثناء اس بات کی دلیل ہے کہ ''الانسان'' سے مراد جمیع انسان ہیں۔

(۳) ﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ﴾ (الحجر:٦٨)

''بے شک یہ میرے مہمان ہیں۔''

''ضیف'' کی جمع ''ضیوف'' ہے لیکن ''ضیوف'' نہیں کہا۔

(۴) ﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ﴾ (المنٰفقون:٤)

''وہ دشمن ہیں ان سے بچ کر رہیں۔''

یہاں ''الْاَعْدَاءُ'' نہیں کہا جو کہ ''عَدُوٌّ'' کی جمع ہے۔

(۵) ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (البقرة:٢٨٥)

''ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے۔''

(۶) ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ (المائدة:٦)

''اور اگر تم جنبی ہو تو پاکی حاصل کرلو۔''

یہاں ''جُنُبًا'' وصف کی مثال ہے۔

(۷) ﴿اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ﴾ (النور:٣١)

''یا وہ بچے جو کہ عورتوں کے پوشیدہ معاملات سے واقف نہ ہوں۔''

یہاں ''الطِّفْل'' اسم جنس کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ علامہ ابن جنی کہتے ہیں کہ اس قسم کا خطاب عام طور پر اسم میں ہوتا ہے جبکہ صفت میں کم ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۸) ﴿وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا﴾ (الحاقة:١٧)

''اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے۔''

یہاں ''الْمَلَكُ'' اسم جنس ہے۔

(۹) ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (الفجر)

''اور آئے گا آپ کا ربّ اور فرشتے صفیں باندھے ہوئے۔''

یہ بھی اسم جنس کی مثال ہے۔ صفت کی مثال درج ذیل ہے:

(۱۰) ﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ﴾ (الفرقان:۲۷)

''اور جس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا۔''

(۱۱) ﴿وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (الرعد)

''اور عنقریب جان لیں گے کافر کہ کس کے لیے آخرت کا گھر ہے۔''

⑭ واحد کو جمع کے لفظ کے ساتھ خطاب کرنا:

بعض اوقات خطاب فرد واحد کو ہوتا ہے لیکن صیغہ خطاب جمع کا ہوتا ہے۔ مثلاً:

(۱) ﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ (المؤمنون:۵۱)

''اے رسول (ﷺ)! آپ پاکیزہ چیزوں میں سے کھائیں اور نیک عمل کریں۔''

یہاں ''رُسُل'' جمع کا صیغہ ہے اور مراد آپ ﷺ ہیں' کیونکہ آپؐ کی زندگی میں نہ کوئی رسول تھا اور نہ آپؐ کے بعد کوئی رسول آنے والا ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ﴾ (المؤمنون:۵۴)

''آپؐ ان کو چھوڑ دیں وہ اپنی بے ہوشی میں پڑے رہیں۔''

یہ بات اس کی دلیل ہے کہ پچھلی آیات میں ''الرُّسُل'' سے مراد صرف آپؐ ہی ہیں۔

(۲) ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (النحل:۱۲۶)

''اگر وہ تم پر زیادتی کریں تو تم ان پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی تم پر زیادتی کی گئی' اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔''

یہاں پر بھی خطاب آپ ﷺ سے ہے۔ اس کی دلیل اگلی آیت ہے۔

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (النحل:۱۲۷)

''اور آپ صبر کریں اور آپ کا صبر اللہ ہی کے ساتھ ہے۔''

(۳) ﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ﴾ (النور:۲۲)

''اور نہ قسم کھائیں وہ لوگ جو تم میں سے صاحب فضل اور حیثیت والے ہیں۔''

یہاں خطاب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے۔

(۴) ﴿فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا﴾ (ھود:۱۴)

''پھر اگر نہ قبول کریں تمہاری بات کو تو جان لو۔''

یہاں بھی خطاب آپ ﷺ سے ہے۔

(۵) ﴿فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ﴾ (الشعراء:۲۱)

''پس میں بھاگا تم سے جب میں نے تم سے خوف محسوس کیا۔''

''تم'' سے مراد فرعون ہے۔

(۶) ﴿حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝﴾ (المؤمنون)

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی ایک کو موت آئے گی تو کہے گا: اے میرے ربّ! مجھے واپس بھیج دے۔''

یہاں ''اِرْجِعُوْنِ'' سے مراد ''اِرْجِعْنِیْ'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی وجہ سے جمع میں خطاب کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عام طور پر اپنے بارے میں کہتے ہیں: ''نَحْنُ جَعَلْنَا'' ہم نے یہ کام کیا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ''رَبِّ'' استغاثہ ہے اور ''اِرْجِعُوْنِ'' میں خطاب فرشتوں سے ہے۔ ''السُّهَيْلِيْ'' نے کہا ہے کہ یہاں مخلوق مراد ہے' کیونکہ یہ اس شخص کا قول نقل کیا گیا ہے جس کے پاس موت کے وقت شیاطین اور عذاب کے فرشتے آتے ہیں تو اس کا حافظہ خراب ہو جاتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ کیا کہے۔ اس حال میں وہ مخلوق کو پکارتا ہے کہ مجھے موت سے بچالو۔

(۷) ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ﴾ (الزخرف:۳۲)

''ہم نے ان کے درمیان ان کی روزی تقسیم کر دی''۔

اللہ کے لیے جمع کی ضمیر (نَحْنُ) استعمال ہوئی ہے۔

''المبرد'' نے ''الکامل'' میں کہا ہے کہ جمع کی ضمیر مخلوق میں سے کسی کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ یہ تکبر ہے اور تکبر اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۸) ﴿اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۚ﴾ (النور:۲۶)

''وہ لوگ اس سے پاک ہیں جو وہ باتیں بنا رہے ہیں۔''

اس سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

(۹) ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ (الشعراء)

''قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا۔''

یہاں ''الْمُرْسَلِيْنَ'' سے مراد حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔

(۱۰) ﴿فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۝﴾ (النحل)

''پس (میں) دیکھتی ہوں کیا جواب لے کر سفیر واپس آتے ہیں۔''

یہاں ''الْمُرْسَلُوْنَ'' ایک سفیر کے لیے استعمال ہوا ہے۔اس کی دلیل اگلی آیت ہے۔

﴿اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ﴾ (النمل:۳۷)

''تو ان کی طرف لوٹ جا۔''

(۱۱) ﴿اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً﴾ (التوبۃ:٦٦)

''اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر دیں گے تو ایک گروہ کو عذاب بھی دیں گے۔''

قتادہ نے کہا یہاں پہلے ''طائفۃ'' سے مراد ایک آدمی ہے۔وہ منافق نبی ﷺ کے بارے میں جو کہتے تھے وہ ان سے اس بارے میں تعاون نہ کرتا تھا۔ (جاری ہے)

بقیہ: نباتاتِ قرآن

محترم محقق نے قرآنی نام ''سِدر۔سِدرۃ'' لکھا ہے۔نہ جانے انہوں نے عربی نام ارز العرب اور ارز لبنان کیوں لکھ دیا ہے' حالانکہ دونوں کے معنوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ایک کے معنی ہیں بیری کا درخت اور دوسرے کے معنی ہیں چاول۔عربی میں بھی اس کا نام وہی ہے جو قرآن میں ہے۔

ایک اور مغالطہ محقق کو یہ لگا ہے کہ انہوں نے اصوات کی مناسبت سے اسے CEDAR لکھ دیا ہے' حالانکہ انگریزی میں اسے "Lotus Ja Jajube, Christ Thorn" کہا جاتا ہے۔

فاضل محقق نے اس کا نباتاتی نام بھی غلط لکھا ہے۔سِدرہ کا نباتاتی نام Zizyphus Linnaeus rhamnus spina christi یا spina christi ہے۔اس کے لیے لین کی ''مد القاموس'' دیکھی جا سکتی ہے۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دَورِ جدید کا علمی چیلنج اور اُس کا حل

تحریر: مولانا غلام اللہ خان حقانی

آج جس دَور سے ہم گزر رہے ہیں دورِ جدید کہلاتا ہے۔ یہ دَور مغربی فکر و فلسفہ اور علوم وفنون کی بالادستی کا دَور ہے۔ مغرب کے فلاسفہ' حکما اور علماءِ سائنس نے دو تین سو سال پہلے خُدا' کائنات' انسان' زندگی اور دنیا کے متعلق ایسے نظریات دیے جن سے انسان کا فکری مزاج تبدیل ہوا۔ قرآن مجید میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۴) ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے کہ ہر انسان اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کرتا ہے''۔ اُس کا شاکلہ یعنی فکری مزاج اگر ضلالت پر مبنی ہے تو وہ لامحالہ ضلالت کے کام کی طرف مائل ہوگا۔ اور اگر اُس کا شاکلہ شاکلۂ ہدایت ہے تو اُس سے صحیح اعمال کا صدور ہوگا۔

اسلام کے ظہور سے پہلے انسانوں پر شاکلۂ ضلالت کا غلبہ تھا۔ اُن کا یہ شاکلہ مشرکانہ عقائد کے تحت بنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ نے اپنی غیر معمولی جدوجہد سے اس شاکلۂ ضلالت کو توڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا میں شاکلۂ ہدایت کا دَور شروع ہوا۔ اس دور میں انسان کے فکری مزاج کا مرکز ومحور خُدا بنا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ کائنات کے سارے واقعات ایک خُدا کے حکم سے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اور خُدا کا یہی تصور انسانی اعمال کی تشکیل کرتا تھا۔ اُس دور کو ہم دورِ قدیم کہتے ہیں جو اٹھارہویں صدی تک قائم رہا۔

اس کے بعد ایک نیا عہد شروع ہوا جس میں شاکلۂ انسانی دوبارہ تبدیل ہوا۔ اب انسان کے فکری مزاج کا مرکز ومحور خُدا کے بجائے فطرت (nature) بنا۔ انسان کو یقین دلایا گیا کہ کائنات کے تمام واقعات کچھ قوانین کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں' لہٰذا کسی غیر مرئی خُدا کا تصور کرنا سراسر حماقت ہے۔ غالباً یہی وہ دور ہے جس میں اکبر الٰہ آبادی نے اس فکر کے غلبے کو دیکھ کر یا بالفاظِ دیگر اُس شاکلۂ انسانی کو تبدیل ہوتا ہوا محسوس کر کے کہا تھا:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خُدا کا اِس زمانے میں!

جب شاکلۂ انسانی تبدیل ہوا تو اب اقوامِ عالم مجبور ہیں کہ وہ اس طرح سوچیں جس طرح اہلِ مغرب سوچتے ہیں اور زندگی گزارنے کے وہ طریقے اپنائیں جو اہلِ مغرب نے اپنائے ہیں۔ اس تبدیلی کو بھی بڑے واضح انداز میں اکبرالہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:۔

جو میری ہستی تھی مٹ چکی ہے
نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ اُن کا دماغ میرا
خیال اُن کا زبان میری

اس دورِ جدید کو برپا کرنے اور شاکلۂ انسانی کو تبدیل کرنے میں ایک لمبی مدت اور سینکڑوں اشخاص کا عمل شامل ہے۔ تاہم علامتی طور پر تین شخصیات کے فکر و نظر نے اس تبدیلی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں نمایاں ترین شخصیت جسے دورِ جدید کا بانی کہا جاتا ہے' سر آئیزک نیوٹن ہے جس کا زمانہ ۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء ہے۔ نیوٹن نے کائنات کے چھوٹے بڑے واقعات اور نظامِ شمسی وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ اُس نے ثابت کیا کہ سورج' چاند اور سیارے قانونِ تجاذب (Law of Gravitation) کی وجہ سے خلا میں حرکت کر رہے ہیں۔ نیوٹن نے دریافت کیا کہ کائنات کے تمام واقعات قوانینِ فطرت کے تحت رونما ہو رہے ہیں جس کو علم الحساب کی زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ نظریہ اُس سے پہلے گلیلیو نے سولہویں صدی میں دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ:

"The book of nature is written in the form of mathematics."

یعنی فطرت کی کتاب سب کی سب ریاضی کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ نیوٹن نے اٹھارہویں صدی میں اس فکری عمل کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ نیوٹن کی ان تحقیقات کی اشاعت نے پورے انسانی عقیدہ کو متزلزل کر دیا۔ اسی کی بنا پر جدید مفکرین نے قدیم دَور کے راسخ شدہ عقائد کے خلاف یہ اعلان کیا:

"If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes."

یعنی واقعات اگر فطرت کے اسباب کے تحت پیش آتے ہیں تو وہ مافوق الفطرت اسباب کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔

نیوٹن کے بعد مفکرین کے جس گروہ نے جدید شاکلۂ انسانی کو بنانے میں اہم کردار ادا کیا

اس گروہ میں نمائندہ شخصیت چارلس ڈارون (۱۸۰۲ء تا ۱۸۸۲ء) کی ہے۔ نیوٹن نے جس طرح طبیعی دنیا (Physical World) کو قانونِ فطرت کے تحت حرکت کرتے ہوئے دکھایا تھا اسی طرح ڈارون نے بتایا کہ حیاتیاتی دنیا (Biological World) بھی قانونِ فطرت کے تحت سفر کر رہی ہے۔ ابتدائی جرثومہ سے لے کر انسان تک جتنے بھی حیاتیاتی مظاہر اس دنیا میں دکھائی دیتے ہیں وہ سب کے سب معلوم قانونِ فطرت کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔ اس نظریہ کے نتیجہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ساری دنیا میں یہ ذہن بن گیا کہ انسان کی تخلیق کا خالق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تخلیق اُس قانونِ فطرت کی مظہر ہے جس کو عام طور پر ارتقاء (evolution) کہا جاتا ہے۔

نیوٹن اور ڈارون کے بعد جس شخصیت نے انسانی شاکلہ کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا وہ ہے کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء)۔ وہ قدیم انسانی تاریخ کو تقدیر کا کرشمہ سمجھتا تھا کہ ایک بزرگ اور برتر خُدا ہے جو تاریخی واقعات مثلاً قوموں کے عروج و زوال، تہذیب و تمدن کا بننا اور مٹنا وغیرہ کو تشکیل دیتا رہتا ہے۔ مارکس نے آ کر انسانی تاریخ کے سفر کا ایک مادی فلسفہ پیش کیا جسے اُس نے تاریخ کی علمی تعبیر کا نام دیا۔ اُس نے کہا کہ: ''تاریخ میں خود اُس کے اپنے اندرونی قانون کے تحت طبقاتی جدوجہد جاری رہتی ہے، اور یہی طبقاتی جدوجہد تاریخ کے حال اور مستقبل کی صورت گری کرتی ہے''۔ مارکس کے اس فلسفے اور اس کی بنیاد پر پیدا ہونے والے بے شمار لٹریچر نے ساری دنیا کے انسانوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر کیا۔ لوگ تاریخ کو ایک غیر خُدائی واقعہ کی نظر سے دیکھنے لگے، جبکہ اس سے پہلے لوگ اسے خُدائی واقعہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔

بہر حال آج پورے کُرۂ ارضی پر یہی افکار و نظریات اور تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا تین سو سال پہلے یورپ میں ہوئی تھی۔ یورپ میں اس حوالے سے فلسفہ کے جتنے بھی مقبول مدارس وجود میں آئے ہیں اُن کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اور عقل کی گرفت میں نہ آئے اُس کے وجود پر یقین کرنا مناسب نہیں۔ چونکہ خُدا، روح اور حیات بعد الممات تینوں غیر محسوس ہیں لہٰذا ان کی ہستی پر یقین خلافِ عقل ہے۔ اس فکر نے انسانی زندگی کے تمام عملی نقشوں کو یکسر بدل دیا، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو کٹر مذہبی خیال کرتے ہیں، اُن کے مشاغل اور سرگرمیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ بھی سورۃ البقرۃ کی آیت ۸ کا مصداق ٹھہرتے ہیں جس میں فرمایا گیا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ

اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ ''لوگوں میں سے بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' حالانکہ وہ مؤمن نہیں''۔ اس لیے کہ یہ ایک فکری طوفان ہے جس سے اپنے آپ کو بچانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

یہ تو فکر ونظر کی بنیاد پر ایک فلسفیانہ بحث تھی۔ عملی اعتبار سے اس Scientific Phenomenon کے ذریعے تاریخ انسانی میں پہلی بار طاقت کے معیار کو بدل دیا گیا' وہ معیار جس سے پچھلے دور کا انسان ناواقف تھا۔ اس لیے کہ تاریخ کے پچھلے ادوار میں فریقین کے مابین زیادہ تر کمیت کا (quantitative) فرق ہوا کرتا تھا' اب اہل مغرب نے ایسا دور تخلیق کیا جس میں اُن کے اور اُن کے مخالفین کے درمیان کیفیت کا (qualitative) فرق پیدا ہوگیا۔ اس تبدیلی نے مغرب کو دوسری قوموں پر فیصلہ کن اور واضح برتری دے دی۔ اس لیے کہ اگر فریقِ اوّل کے پاس دست کاری کی صنعت ہے اور فریقِ ثانی کے پاس مشینی صنعت ہے' اگر فریقِ اوّل بحری سفر کے لیے بادبانی کشتی استعمال کرتا ہے اور فریقِ ثانی دُخانی کشتی استعمال کرتا ہے' اگر فریقِ اوّل کے پاس دستی ہتھیار ہیں اور فریقِ ثانی کے پاس سیلائنس کا پورا نظام اور دُور مار ہتھیار موجود ہیں' اگر فریقِ اوّل خشکی کے سفر کے لیے حیوانی قوت سے کام لے رہا ہے اور فریقِ ثانی سواری کے لیے انجن کی قوت استعمال کرتا ہے تو فریقِ ثانی کو فریقِ اوّل پر ایک واضح اور فیصلہ کن برتری حاصل ہے۔ فکر ونظر' علوم وفنون اور معیارِ قوت کی اس تبدیلی نے دنیا کے اندر عملی اعتبار سے جس تہذیب وتمدن کو رواج دیا ہے اُس میں نہ خُدا کا ذکر ملتا ہے اور نہ روح وآخرت کا۔ اس لیے کہ خُدا' روح اور آخرت جس شاکلۂ انسانی کے اَبعادِ ثلاثہ تھے وہ شاکلہ ہی توڑ دیا گیا ہے۔ اب ایک نیا شاکلۂ انسانی ہے اور اس کے اپنے اَبعاد (dimensions) ہیں۔ اس وقت جس تہذیب وتمدن کا پورے کرۂ ارضی پر ڈنکا بج رہا ہے یہ وہ تہذیب وتمدن ہے جسے مغربی دنیا ''نیو ورلڈ آرڈر'' (New World Order) کا نام دیتی ہے۔ یعنی ''دنیا کے لیے ایک نیا نظامِ زندگی''۔

اس تہذیب کا اگر ہم جائزہ لیں تو اس کے جو نمایاں اوصاف ہیں ان میں پہلا وصف آزاد خیالی ہے۔ آزاد خیالی کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنی سوچ' اپنے اختیار' اپنی فکر اور اپنے عمل میں آزاد ہے۔ وہ جو چاہے سوچ سکتا ہے اور جو چاہے بول سکتا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خُدا کا بیٹا کہے یا نعوذ باللہ انہیں ولدِ زنا قرار دے' وہ آزاد ہے۔ یہود نے اس پر پوری فلم بنائی ہے جس میں انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو سیدہ مریم علیہا السلام کے منگیتر جوزف

کارپینٹر کا حرامی بچہ قرار دیا ہے جس سے ابھی حضرت مریم علیہا السلام کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔اس لبرل ازم کے حوالے سے ہم سے مغرب کا مطالبہ ہے کہ سلمان رشدی نے اگر Quranic Verses کو Satanic Verses کہا ہے یا اگر قادیانی نبوت کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو یہ تو آزاد خیالی کا تقاضا ہے' تم کو برداشت کرنا چاہیے۔تم نے قادیانیوں کو اپنے قومی وجود سے کاٹ پھینکا' یہ جدید تہذیب کے سراسر خلاف ہے۔ ہر شخص کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہے۔ بلکہ اِس پوپ نے جو ابھی ابھی چل بسا ہے' یہ فتویٰ دیا تھا کہ توہینِ رسالت کے قانون میں مسلمانوں کو ریلیف دینا چاہیے۔

اس عالمی تہذیب کا دوسرا نمایاں وصف سیکولرزم ہے۔ سیکولرزم کا مطلب ہے لادینیت + ہمہ مذہبیت۔ سیکولرزم انسانی زندگی کو دو گوشوں میں تقسیم کرتا ہے: انفرادی گوشہ اور اجتماعی گوشہ۔ انفرادی گوشے کو وہ مذہب کہتے ہیں جس میں ہر شخص کو تین چیزوں میں آزادی حاصل ہوتی ہے: عقیدہ' عبادات اور رسومات۔ یعنی انسان اپنے عقیدے میں آزاد ہے۔ وہ چاہے ایک خُدا کو مانے یا لاکھوں کو' پتھر کو سجدہ کرے یا سورج اور ستاروں کو' وہ اس میں آزاد ہے۔ انسان عبادات میں آزاد ہے۔ وہ خُدا کو خوش اور راضی کرنے کے لیے چاہے مسجد میں آئے یا چرچ اور مندر میں' اسے آزادی ہے۔ اسی طرح انسان رسومات میں آزاد ہے۔ غم اور خوشی کے موقعوں پر وہ اپنے عقیدے کے مطابق جو بھی کرے اُسے آزادی ہے' چاہے وہ بچے کی پیدائش پر اس کے کان میں اقامت اور اذان کہہ دے یا اس موقع پر ناچ گانے کی محفل منعقد کرے' فوت ہونے پر مُردے کو چاہے تو دفن کرے اور چاہے تو اُسے آگ میں جلائے۔

سیکولرزم کی رو سے انسان کی زندگی کا دوسرا گوشہ اس کی اجتماعی زندگی ہے' یعنی سیاسی نظام' معاشی نظام اور معاشرتی نظام۔ ان اجتماعی گوشوں سے مذہب کا کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ سیاسی نظام ہو یا معاشی نظام' معاشرتی نظام ہو یا عائلی نظام' یہ بنیں گے لوگوں کی صوابدید پر۔ لہٰذا سیاسی نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی' جمہوریت ہوگی یا مارشل لاء' اس میں عقیدے اور عبادات کی طرح اُس خُدا سے نہیں پوچھا جائے گا۔ معاشی نظام کیا ہوگا؟ سود اور جوئے پر مبنی ہوگا یا لاٹری اور پرائز بانڈز پر' عوام اس کا فیصلہ کریں گے' کسی خُدا یا بھگوان سے نہیں پوچھا جائے گا۔ معاشرتی نظام کیا ہوگا؟ مخلوط معاشرہ ہوگا جہاں خواتین اور مَرد ایک ساتھ رہیں گے یا پردے کا نظام ہوگا' مخلوط تعلیم (Co-education) ہوگی یا بچے اور بچیوں کے لیے الگ

الگ ادارے قائم کیے جائیں گے' یہ لوگوں کی صوابدید پر ہوگا' کسی مذہب سے نہیں پوچھا جائے گا۔ دوسری بار صدر بش جب منتخب ہوئے ہیں تو اُنہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اس کا اعلان کیا ہے کہ:

"We are ready to embrace Islam as a religion but we can not accept Islam as a politico-socio-economic system."

یہ سیکولرزم اس بے خُدا تہذیب کا دوسرا بڑا وصف ہے کہ اَن دیکھے خُدا کی superiority کو توڑ دو' تاکہ دنیا ترقی کرے اور لوگوں کو آزادی مل جائے۔ پھر سیکولرزم کا سیاسی نظام جمہوریت ہے جو اوّل تا آخر خُدا کی نفی پر مبنی ہے۔ اگرچہ لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جمہوریت نام ہے عوام کے حقوق اُن کے دروازوں تک پہنچانے کا' لیکن جمہوریت ملوکیت' ڈکٹیٹرشپ اور بادشاہت سے بڑھ کر ایک ابلیسی ہتھکنڈہ ہے۔ بقول اقبالؔ:۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن ' اندروں چنگیز سے تاریک تر!

چنانچہ جمہوریت غلامی کی بدترین شکل ہے۔ یہ آزادی کی آڑ میں غلامی کی ایسی شکل ہے جو انسان کے جملہ قویٰ اور صلاحیتوں کو مفلوج بنا دیتی ہیں۔ بقولِ اقبالؔ:۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

بہرحال سیکولرزم کا سیاسی نظام جمہوریت ہے' جبکہ اس کا معاشی نظام سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام ہے جس نے اِس وقت ساری دنیا میں بے روزگاری' مہنگائی' کرپشن' حرام خوری' فحاشی و عریانی' خون خرابہ اور دنگا فساد برپا کیا ہوا ہے۔ تہذیب جدید کا اس دنیا کے بارے میں تصور یہ ہے کہ دنیا بس یہی دنیا ہے' آگے کوئی اور دنیا نہیں' لہٰذا یہاں جتنی سہولتیں اور لذتیں ہیں اُن کو حاصل کیا جائے۔ آج consumerism کا یہ جذبہ تقریباً تمام انسانوں میں موجود ہے جس نے اِس خطرناک صورت حال سے انسان کو دوچار کیا ہے کہ ہر قسم کی لذت پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ آخر جنسی جذبہ انسان کے اندر ہے تو اُسے حق حاصل ہونا

چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے اس جذبے کی تسکین کرے۔ دو عورتیں مل کر اگر تسکین حاصل کر سکتی ہوں تو کریں۔ دو مرد مل کر اگر لذت حاصل کر سکتے ہوں تو اُن پر پابندی نہ ہو۔ یہ تو پیاس جیسا جذبہ ہے' گلاس ملے تو اُس سے پانی پی لیا جائے' کٹورا مل جائے تو اس سے پیاس بجھالی جائے' برتن نہیں ملا تو اوک لگا کر پانی پی لیا جائے' اس میں کوئی لمبے چوڑے قواعد و ضوابط اور اخلاقیات کی بحث کی ضرورت نہیں۔ ماں بہن اور اپنے پرائے کی لوگوں نے مصنوعی قدغنیں لگادی ہیں' اُن کو ختم ہو جانا چاہیے۔

یہ ہے آج کے دور کے انسان کا شاکلۂ جدیدہ۔ آج اس کا فکری مزاج اُس کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ گمراہی اور ضلالت کا راستہ اختیار کرے۔

مذہب اور سائنس دونوں وسیع موضوعات ہیں۔ مجھے یہاں سائنس یا مذہب کی تفصیلات پر کچھ نہیں لکھنا۔ اس تحریر کا موضوع دراصل سائنس کے اس پُرزور دعوے کی وضاحت کرنا ہے کہ سائنس کی دریافتوں نے مذہب کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے' یا سائنس کا یہ دعویٰ کہ قوانینِ فطرت کی دریافت کے بعد خُدا کو ماننے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قدیم انسان سمجھتا تھا کہ ایک بزرگ اور برتر ہستی یعنی خُدا ہے جو اس کائنات کے جملہ اُمور کو سرانجام دے رہا ہے۔ قدیم انسان نے یہ رائے اس لیے قائم کی تھی کہ اس کے بغیر اِن اُمور کی توجیہہ کسی اور طریقے سے ممکن نہ تھی۔ مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ سورج کو کون نکالتا ہے؟ قدیم انسان مجبور تھا کہ وہ کہے کہ اللہ! لیکن جب سائنس نے دریافت کیا کہ اس کائنات میں ہر واقعہ کے پیچھے ایک ایسا سبب موجود ہے جس کو تجربہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے' Physical World ہو یا Biological World' یہ کچھ قوانین کی پابندی سے رواں دواں ہیں' سورج کو نکالنے والا اللہ نہیں ہے' بلکہ "Law of Gravitation" (جذب و کشش کا قانون) ہے جو اِس عمل کے پیچھے کارفرما ہے' سمندری طوفان اللہ کے حکم سے نہیں آتا' بلکہ یہ تو چاند کی کشش (Gravitational Pull) اور دنیا کی جغرافیائی وضع و ہیئت (Geographical Configuration) کے سبب سے ہوتا ہے تو انسان کی اس سوچ اور رائے میں تزلزل پیدا ہوا۔ ان قوانین کی دریافت کے بعد یورپ کے فلاسفہ اور حکماء نے بڑے بڑے دعوے کیے۔ مثلاً جرمن فلسفی کانٹ نے کہا کہ مجھے مادہ مہیا کرو تو میں تمہیں بتادوں گا کہ دنیا اس مادے سے کس طرح بنائی جاتی ہے۔ ہیکل (Haeckle) نے دعویٰ کیا کہ پانی' کیمیاوی اجزاء اور وقت ملیں تو وہ ایک انسان کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ ہٹشے نے اعلان

کر دیا کہ اب خُدا مر چکا ہے۔

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جدید تصور کی رو سے کائنات کے تمام اُمور قوانینِ فطرت کے ذریعے وقوع پذیر ہو رہے ہیں' لہٰذا کسی اَن دیکھے خُدا کا تصور سراسر حماقت ہے۔ سائنس کی بنیاد پر بننے والے اس نظریے کو اگر ہم ایمان بالتجربہ والشہود سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا' جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شے مشاہدہ اور تجربہ یا حواسِ خمسہ اور عقل کی گرفت میں آ جائے اُس پر یقین کیا جائے اور جو شے اس معیار پر پوری نہ اُترے اُس کا انکار کر دیا جائے۔ اس کے مقابلے میں مذہب کی تعلیم ایمان بالغیب کی تعلیم ہے۔ یعنی اس کائنات کا خالق اور مدبر ایک غیر مرئی خُدا ہے' لہٰذا اس پر ایمان لایا جائے اور کائنات میں رونما ہونے والے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو اس کی طرف منسوب کیا جائے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ نظریہ اللہ کے پیغمبروں نے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اُس وقت کے انسانوں نے اس پر شک وشبہ کا اظہار کیا تو اپنے مخاطبین کے سامنے اللہ کے پیغمبروں نے اپنے اس دعویٰ پر یہ عقلی دلیل پیش کی کہ: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (ابرٰھیم:١٠) ''کیا تمہیں اُس خُدا کے بارے میں شک ہے جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے؟'' دلیل کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ شک اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس وسیع وعریض کائنات اور اس کے اَن گنت پھیلے ہوئے ظواہر ومظاہر مشاہداتی سطح پر اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ واقعی اس کائنات کے جملہ اُمور کا سرانجام دینے والا خُدا ہے۔ پیغمبروں کا زمانہ سائنس کا زمانہ نہ تھا' اُس زمانے میں انسان کائنات کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ آج کائنات کے بارے میں انسان کے علم میں کروڑوں گنا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کل جبکہ انسان شعور کی اس پختگی اور علم وفنون کے اس کمال تک نہیں پہنچا تھا' تو وہ اس نظریے کو قبول کرنے پر جتنا مجبور اور محتاج تھا' آج کا انسان بھی شعور کی پختگی اور علوم وفنون کے کمال پر پہنچنے کے علی الرغم اتنا ہی مجبور اور لاچار ہے کہ اس نظریےؑ کے سامنے جھک جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تحقیقات نے اس نظریے کی صداقت کو اور زیادہ واضح انداز میں ثابت کیا ہے۔ چنانچہ جدید مفکرین کا قول ہے کہ یہ کائنات حد درجہ محکم اور منتظم ہے اور ہر آن ایک محرک اور منتظم کی طالب ہے۔ غالباً اس خاص پہلو سے برطانیہ کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینز (Sir James Jeans) اپنی کتاب "The Mysterious Universe" (مطبوعہ ١٩٤٨ء) کے صفحہ ١٢٣ پر خالص سائنسی

نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج ایسے قوی دلائل موجود ہیں جو طبیعی سائنس کو یہ ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ علم کا دریا ایک ''غیر مشینی حقیقت'' (Non Mechanical Reality) کی طرف چلا جارہا ہے۔ کائنات ایک بہت بڑی مشین کے بجائے ایک بہت بڑے خیال (Great Thought) سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ ذہن (mind) اتفاقاً محض ایک اجنبی کی حیثیت سے اس مادی دنیا میں وارد نہیں ہوگیا ہے۔ اب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں کہ ہم اُس ذہن کا اس عالم مادی کے خالق اور حکمران کی حیثیت سے استقبال کریں۔ یہ ذہن بلاشبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں ہے' بلکہ ایک ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی دماغ کی تخلیق کی۔ اور یہ سب کچھ ایک اسکیم کی شکل میں پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ جدید علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم دنیا کے بارے میں اپنے اُن خیالات پر نظرثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لیے تھے۔ ہم نے دریافت کرلیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمران (Controlling or designing power) کی شہادت دے رہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ مشابہ ہے' جذبات واحساسات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس طرز پر سوچنے کے اعتبار سے جس کو ہم ''ریاضیاتی ذہن'' (Mathematical Mind) کے الفاظ میں ادا کرسکتے ہیں۔''

مغربی مفکرین' فلاسفہ اور علماءِ سائنس کا یہ دعویٰ کہ کائنات کچھ لگے بندھے قوانین کے تحت حرکت کررہی ہے' کوئی خُدا نہیں جو اِس کو حرکت دے رہا ہے' اُس وقت بھی علمی اعتبار سے نہایت کمزور تھا اور اب بھی خود سائنس نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس بات کا اعتراف کرلیا ہے کہ اس کے پاس اس قسم کا دعویٰ کرنے کے لیے اطمینان بخش دلائل موجود نہیں ہیں۔ ایک عیسائی عالم کا قول ہے:

"Nature does not explain, she is himself in need of an explanation."

یعنی فطرت کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی' وہ خود اپنے لیے ایک توجیہہ کی طالب ہے۔ وہ آگے لکھتا ہے: ''Nature is a fact not an explanation.'' کہ فطرت کا قانون تو کائنات کا ایک واقعہ ہے' اس کو کائنات کی توجیہہ نہیں کہا جاسکتا۔ گویا مخالفینِ مذہب جن سائنسی دریافتوں کو فطرت کی توجیہہ کا نام دے کر اس کو خُدا کا بدل ٹھہرا رہے ہیں اسے ہم فطرت کا طریقۂ کار کہہ سکتے ہیں' یعنی خُدا اِن ہی قوانین کے ذریعے کائنات میں اپنا عمل کرتا

ہے۔ ان قوانین میں سائنس اگر کسی قانون کو دریافت کرتی ہے تو اس قانون کو خُدا کا بدل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مثلاً سائنس نے دریافت کیا کہ جوار بھاٹا یا مدّ و جزر یعنی سمندر میں پانی کا اُتار چڑھاؤ درحقیقت چاند کی کشش اور دنیا کی جغرافیائی وضع و ہیئت کے سبب سے ہوتا ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے کہ طوفان قوتِ کشش اور زمین کی جغرافیائی وضع و ہیئت کی وجہ سے آتا ہے' لیکن اس سے ہمارے عقیدے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا' اس لیے کہ قوتِ کشش اور جغرافیائی بناوٹ بھی تو خُدا کی مخلوق ہیں اور وہ اِن ذرائع سے اپنا فعل سرانجام دے رہا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ طوفان کا حقیقی سبب یہ قوانین نہیں' بلکہ اس کا حقیقی سبب خُدا ہی ہے۔ جان ولسن اپنی شہرۂ آفاق کتاب "Philosophy & Religion" (مطبوعہ ۱۸۶۱ء لندن) کے صفحہ ۳۶ پر لکھتا ہے:

> *"This does not destroy my belief. It is still God, working through these things, who is responsible for the tides."*

اس میں یہ نکتہ نوٹ کرنے کا ہے کہ ان قوانین کو دریافت کرنے والے سائنس دانوں کا یہ منشا نہیں تھا۔ مثلاً نیوٹن نے کہا تھا کہ یہ خُدا کا طریقۂ کار ہے' یعنی خُدا اسباب و علل (causes and effects) کے ذریعے کائنات میں اپنی منشا پوری کر رہا ہے۔ لیکن اِن قوانین کے دریافت ہوتے ہی جو فلاسفہ اور مفکرین تھے انہوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لے کر یہ دعویٰ کیا کہ یہ دریافت خُدا کا سائنسی بدل ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جو اِن سائنسی دریافتوں کی روشنی میں فلسفے کی تشکیل کر رہے تھے۔ لہٰذا جب اُن کو اسی کے اندر الحاد کا ثبوت ملا تو انہوں نے اس کی بنیاد پر ایک پورا نظامِ فکر بنا ڈالا۔ مگر اُن مفکرین کی یہ خوشی زیادہ دیر باقی نہ رہی' اس لیے کہ سائنس کے علم میں ایسے بہت سے حقائق سامنے آئے ہیں جو اِس قسم کی تعبیر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مثلاً ریڈیم ایک تابکار عنصر ہے۔ اس کے الیکٹران خود بخود فطری عمل کے تحت مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں۔ بے شمار تجربے کیے گئے کہ اس تابکاری کا سبب کیا ہے' مگر ہر تجربہ ناکام رہا۔ ہم کو آج تک نہیں معلوم کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے میں کوئی خاص الیکٹران جب اپنے ایٹمی نظام سے ٹوٹ کر نکلتا ہے تو اس کا سبب کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کی توجیہہ میں سائنس نے بہت سے نظریے قائم کیے ہیں۔ مگر ایک سائنس دان اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ مقناطیس لوہے کو کیوں اپنی طرف کھینچتا ہے' شاید اس لیے کہ اس کے خالق نے

اس کو یہی حکم دیا ہے!

سائنس کے تحقیقی مطالعہ کے بعد اب یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ Law of Causation (قانونِ علت) اِن معنوں میں کوئی مطلق حقیقت نہیں ہے' جیسا کہ انیسویں صدی میں فرض کرلیا گیا تھا۔ ایک بہت بڑے یورپی مفکر کا قول ہے کہ ''اس دنیا کا نظام محض اتفاقی طور پر وجود میں آ جانے والے کسی علت و معلول (Cause and Effect) کے قانون کے تحت نہیں چل رہا ہے' بلکہ اس کے پیچھے ایک شعوری ذہن ہے جو بالارادہ اس کو چلا رہا ہے۔ سائنس کی یہ واپسی مذہب کی صداقت کا ایک ایسا واضح ثبوت ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح حیاتیات کے میدان میں نظریۂ ارتقاء کے حوالے سے یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ زندگی کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے کسی باشعور خُدا کو ماننے کی ضرورت نہیں' کیونکہ جدید مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی صرف تین مادی طاقتوں سے خود بخود حاصل ہونے والا ایک نتیجہ ہے' یعنی: Reproduction, Variation and Differential Survival کہ توالد و تناسُل کے ذریعے مزید زندگیوں کا ظہور' پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فرقوں کا پشت ہا پشت میں ترقی کر کے مکمل ہو جانا۔ اس کی بنا پر مخالفینِ مذہب نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ ڈارون کے انتخابِ طبیعی کے اُصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشوونما پر خُدا کی کارفرمائی کے تصور کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ ارتقاء پسند اہلِ علم کا یہ نظریہ ابھی تک غیر ثابت شدہ ہے' لیکن اسے اگر بلا بحث مان بھی لیا جائے تو اسے ہم خُدائی تخلیق کا طریقۂ کار کہہ سکتے ہیں نہ کہ اندھے بہرے مادے کا عمل۔ اس سلسلے میں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مشینی ارتقاء (Mechanical Evolution) کو آسانی کے ساتھ تخلیقی ارتقاء (Creational Evolution) ثابت کیا جا سکتا ہے' اور سائنس کے حوالے سے مذہب کی مخالفت کرنے والوں کے پاس اس کی تردید کی کوئی واقعی بنیاد نہیں ہوگی' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے بیسویں صدی میں پہنچ کر اپنے سابقہ یقین کو کھو دیا ہے۔ آج جبکہ نیوٹن کی جگہ آئن سٹائن نے لے لی ہے اور پلانک اور رہلیزن برگ نے لاپلاس کے نظریات کو منسوخ کر دیا ہے' مخالفینِ مذہب کے لیے کم از کم علمی بنیاد پر اس قسم کا دعویٰ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ''نظریۂ اضافیت'' (Relativity) اور نظریۂ مقادیر برقیات (Quantum Theory) نے

خود سائنس دانوں کو اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کر لیں کہ یہ ناممکن ہے کہ سائنس میں مشاہد (observer) کو مشاہدہ (observed) سے الگ کیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف چند خارجی مظاہر کو دیکھ سکتے ہیں' اس کی اصل حقیقت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ گویا بیسویں صدی میں سائنس کے اندر جو انقلاب آیا ہے اُس نے سائنسی نقطۂ نظر سے مذہب کی اہمیت ثابت کر دی ہے۔

سائنس کے اندر اس انقلاب سے میری مراد یہ ہے کہ نیوٹن کا نظریہ جو دو سو سال تک سائنس کی دنیا پر حکمران رہا' وہ جدید مطالعہ کے بعد ناقص پایا گیا ہے۔ اگرچہ سابقہ فکر کی جگہ ابھی تک کوئی مکمل نظریہ سامنے نہیں آ سکا ہے' مگر یہ واضح ہے کہ نئے رجحان کے فلسفیانہ تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں جو پچھلے نظریے کے تھے۔ اب یہ دعویٰ نہیں رہا کہ سائنٹیفک طریق مطالعہ ہی حقیقت کو معلوم کرنے کا واحد صحیح طریقہ ہے۔ اب سائنس کے ممتاز علماء یہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

"Science gives us but a partial knowledge of reality."

یعنی سائنس ہم کو صداقت کا جزوی علم دیتی ہے۔

بہرحال یہ ایک سوال ہے کہ کائنات کی آخری ماہیت کیا ہے؟ کیا اس میں قوانین کی کارفرمائی محض مادے کے ذاتی عمل کے طور پر ہے یا کوئی Designer یا Controlling Power یعنی خُدا ہے جس نے اس کائنات کو بالارادہ تخلیق کیا ہے؟ جیسے کسی مشین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے آخری تجزیے میں محض لوہے اور پٹرول کا ایک اتفاقی مرکب ہے' یعنی لوہے اور پٹرول نے ازخود کسی اندھے عمل کے ذریعہ محض اتفاق سے مشین کی صورت اختیار کر لی ہے یا یہ کہ یہ مشین اپنے آخری تجزیے میں انجینئر کا ذہن ہے؟ یعنی مشین سے پہلے ایک پورا ذہن تھا جس نے مادے سے الگ اس کے ڈیزائن کو سوچا اور بالارادہ اسے تیار کیا۔

ذہن کے تعین میں اختلاف کے حوالے سے مختلف گروہ ہو سکتے ہیں۔ جیسے خُدا کو ماننے والے خُدا کو ماننے کے باوجود مختلف گروہوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ فکری و علمی مطالعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت ذہن ہے' یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہب کی تصدیق ہے اور الحاد کی تردید اور سائنسی رجحان میں اسی تبدیلی کو مدنظر رکھ کر مارٹن وائٹ نے کہا تھا کہ بیسویں صدی میں فلسفیانہ ذہن رکھنے والے سائنس دانوں نے ایک نئی صلیبی جنگ (crusade) کا آغاز کر دیا ہے جس میں وہائٹ ہیڈ' ایڈنگٹن اور جیمز جینز کے نام خاص طور پر

قابل ذکر ہیں۔ ان میں انگریز ماہر ریاضیات اور فلسفی الفرڈ نارتھ وہائٹ ہیڈ (۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۷ء) کے نزدیک جدید معلومات یہ ثابت کرتی ہیں کہ ''Nature is alive.''۔ یعنی فطرت بے روح مادہ نہیں' بلکہ زندہ فطرت ہے۔ انگریز ماہر فلکیات سر ارتھر ایڈنگٹن نے موجودہ سائنس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''The stuff of the world is mind stuff.'' یعنی کائنات کا مادہ ایک شے ذہنی ہے۔ ریاضیاتی طبیعیات کا انگریز عالم سر جیمز جینز جدید تحقیقات کی تعبیر اِن الفاظ میں کرتا ہے:

"The universe is a universe of thought."

موجودہ سائنس کے اندر یہ بہت بڑی اور عظیم تبدیلی ہے جسے جے ڈبلیو این سولیون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''The Limitation of Science'' کے صفحہ ۱۳۸ تا ۱۵۰ پر وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ انتہائی مستند سائنس دانوں کے خیالات ہیں جن کا خلاصہ موصوف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"The ultimate nature of the universe is mind."

اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو یہ نہیں ہے کہ تمدنی ترقی کے لیے زیادہ طاقت حاصل ہوگئی ہے' بلکہ یہ تبدیلی وہ ہے جو اِس کی مابعد الطبیعیاتی بنیادوں (Metaphysical Foundations) میں واقع ہوئی ہے۔ گویا کہ اسی ترقی نے مذہب کے موقف کو جدید سائنٹیفک انداز سے واضح کیا ہے۔ علمی اعتبار سے اتنی بڑی اور اہم بلکہ انقلابی تبدیلی واقع ہونے کے باوجود اس نئی فکر کو سائنس دانوں اور فلاسفہ کے حلقوں میں بہت کم پذیرائی ملی ہے اور انہوں نے ابھی تک اپنی قدیم فکر کو ایک شے مقدس سمجھ کر بغیر دلائل کے اس کے ساتھ رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ اس کی واضح اور صاف وجہ تعصب ہے اور انسانی تاریخ اس قسم کے بھونڈے رویّوں سے بھری پڑی ہے کہ حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے باوجود انسان نے محض اس لیے اس کو قبول نہیں کیا کہ تعصب اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

چار سو برس پہلے اٹلی کے علماء نے ارسطو کے مقابلے میں گلیلیو کے نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا' حالانکہ لیننگ ٹاور سے گرنے والے گولے اس کے نظریے کو آنکھوں دیکھی حقیقت بنا چکے تھے۔ پھر یہی تعصب تھا جب انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک (Max plank) نے روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے متعلق نیوٹن کے تصور کو غلط ثابت کر رہی تھیں' تو وقت کے ماہرین نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور

عرصہ تک اس کا مذاق اڑاتے رہے' حالانکہ آج یہ Quantum Theory کی صورت میں علم طبیعیات کے اہم اُصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ تعصب سائنس دانوں میں نہیں ہوسکتا تو اس کی اطلاع کے لیے میں ڈاکٹر ہلز کا یہ قول پیش کرتا ہوں جو اے این گیلکس (A.N. Gilkes) نے اپنی کتاب "Faith For Modern Man" کے صفحہ ۱۰۹ پر نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر ہلز کہتے ہیں:

"I should be the last to claim that we scientific men are less liable to prejudice than other educated men."

یعنی میں آخری شخص ہوں گا جو اِس بات کا دعویٰ کرے کہ ہم سائنس دان دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں میں کم تعصب رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اب انسانی تاریخ کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ علمی اور منطقی طور پر عقل ہی کو بلند مقام حاصل ہے' مگر اکثر معاملات میں ایسا ہوا ہے کہ عقل خود جذبات کی آلۂ کار رہی ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ عقل نے جذبات کو قابو کر کے اس سے ایک بہتر کام لیا ہو۔ اسی رویے کے بارے میں جو حتمی بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کسی شخص پر باہر سے کوئی بات نہیں منوا سکتے جب تک اُس بات کے ماننے کے لیے اس کے اندر از خود آمادگی پیدا نہ ہو چکی ہو۔ اور اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کتابِ ہدایت کے الفاظِ مبارکہ کہ قرآن "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" ہے' یعنی یہ قرآن ہدایت کا ذریعہ اُن لوگوں کے حق میں بن سکتا ہے جن کے اندر اِس ہدایت کو قبول کرنے پر آمادگی پیدا ہو چکی ہو۔

حل کیا ہے؟

دنیا میں فکر و عمل کا جو انقلاب آیا ہے ایک لمبی مدت گزرنے کے باوجود ہمارے علماء اس سے بے خبر ہیں کہ اس وقت فی الواقع جدید مسئلہ کیا ہے؟ بلکہ ہمارے علماء مغربی افکار کو سرے سے جانتے ہی نہیں۔ مدارس اور دارالعلوم چلانا' تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کے ایک قدیم نظام سے وابستہ رہنا' تقریر و تحریر کی صورت میں اپنے آپ کو اسلامی سرگرمیوں میں مشغول رکھنا' فتوے دینا' خطابت اور امامت کے اُمور سرانجام دینا' مناظرے کرنا' جنازے اور نکاح پڑھانا' یہ سارے اُمور اپنی جگہ اہم اور ضروری ہیں' لیکن فکری اور علمی سطح پر شیطانی فلسفوں اور ملحدانہ افکار و نظریات کا توڑ کرنا اور اُسے دلیل سے ردّ کرنا اہلِ علم کا اوّلین فریضہ

تھا' مگر اس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی۔

ایک دَور وہ تھا جب یونان کا فکر و فلسفہ اور تصوّف اسلام کے لیے چیلنج بن کر آیا تھا' تو امام ابن تیمیہؒ نے ''الردّ علی المنطقیّین'' کے ذریعے اور امام غزالیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''تہافۃ الفلاسفۃ'' کے ذریعے یونانی فکر و فلسفہ کے تار و پود بکھیر دیے تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ دَورِ جدید کے اتنے بڑے وسائل اور ذرائع کے ہوتے ہوئے بھی ہم مغربی فکر و فلسفہ کے توڑ کے لیے کچھ نہ کر سکے جو جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے لازمی اور ضروری تھا۔ ہمارے اس عمل پر البرٹ ہورانی کا یہ تبصرہ بالکل صادق آتا ہے کہ:

"Most of the writings of Islam by Muslims are not on the level of current thought."

یعنی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بیشتر اسلامی تحریریں عصری فکر کی ہم سطح نہیں ہیں۔ ہمارے علماءِ دین ایک طرف جدید علوم سے نابلد رہے اور دوسری طرف انہوں نے کچھ فرموداتِ نبوی ﷺ جیسے ((لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا)) اور ((حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ)) اور ((مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ)) کا مطلب یہ لیا کہ اسلام ایک جامد اور محدود نظریۂ حیات ہے اور کتاب و سنت کی صحیح تعبیر و تشریح وہی ہو سکتی ہے جو متقدمین علماء نے کی تھی۔ لہٰذا اُن کے لیے ناممکن ہو گیا کہ ایسی علمی صداقتوں کو اپنا سکیں جو نزولِ قرآن کے زمانہ کے بعد دریافت ہوئی تھیں یا جن کے دریافت کرنے والے غیر مسلم تھے اور وہ لفظی اعتبار سے تو قرآن میں نہیں تھیں مگر معناً قرآن کے اندر موجود تھیں اور قرآن کی روح سے مطابقت رکھتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علماء اُس سیدھی شاہراہ سے ہٹ گئے جس پر خود چلنے اور اُمت کو چلانے کی ذمہ داری اُن کے سپرد ہوئی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ازالہ کس طرح ہو گا؟ یا اس کا حل کیا ہے؟ جان لینا چاہیے کہ اسلام کو دوبارہ عروج کی طرف مائل کرنے کا طریق کار صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم بشدّتِ تمام قرآن کی روح سے وابستہ رہتے ہوئے مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید کریں۔ اگر ہماری تردید علمی اور عقلی لحاظ سے فی الواقع درست اور کامیاب ہو گی تو رفتہ رفتہ اِن غلط تصورات کا اثر بالکل زائل ہو کر شاکلۂ انسانی دوبارہ ہدایت کی طرف پلٹا کھائے گا۔

ویسے اِن تمام فلسفوں کی تردید اجمالی طور پر قرآن میں موجود ہے جو قیامت تک پیدا

ہوتے رہیں گے۔ لیکن ہم محض قرآن کی عبارتوں کو نقل کر کے اغیار کو قائل نہیں کر سکتے' بلکہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر غلط فلسفہ کے بارے میں قرآن کے موقف کو جدید' معیاری' علمی اور عقلی استدلال کا جامہ پہنائیں۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ ہم Philosophy, Biology, Physics اور Psychology کے اُن تمام قدیم و جدید حقائق کو مضمراتِ قرآن میں شمار کریں جو روحِ قرآن کی تائید کرتے ہیں یا اُس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ حدیث نبوی ﷺ ہے: ((اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا)) (سنن الترمذی' کتاب العلم عن رسول اللہ ﷺ' باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب الحکمۃ) ''حکیمانہ بات مؤمن کی گمشدہ متاع ہے اور وہ زیادہ حق دار ہے کہ وہ اُسے اُٹھا لے جہاں سے بھی اُسے ملے''۔ گویا ہمارے لیے کرنے کا اوّلین کام یہ ہے کہ فلسفۂ مغرب اور افکارِ مغرب کے توڑ کے لیے ہم قرآن و احادیث کے مطالب اور معانی کو ایک عقلی سلسلہ میں مربوط کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اس لیے کہ اسلام کی بنیاد محکم حقائق پر ہے جبکہ دنیا کے دوسرے مذاہب اپنی موجودہ صورت میں مفروضات پر قائم ہیں۔ لہٰذا جب مغربی علماء نے قرآن اور بائبل کی علمی اور عقلی جانچ پرکھ کی تو تاریخی اعتبار سے بائبل ایک غیر معتبر کتاب قرار پائی۔ جبکہ اس علمی تحقیق نے قرآن کے بارے میں یہ رائے دی کہ قرآن کو مکمل طور پر تاریخی اعتباریت (Historical Credibility) حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے نظریۂ حیات کے ممکنات کے اندر اس بات کی واضح شہادت موجود ہے کہ ہم مسلمان عنقریب خُدا کے تصور کو سائنس سے متحد کر کے مستقبل کے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کی قیادت کریں گے جس کو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب ''قرآن اور علمِ جدید'' میں بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ:

> ''ایسا وقت ضرور آئے گا جب قرآن کے مطالب اپنی تفصیلات اور جُزئیات کی فراوانی کی وجہ سے ایک نظامِ حکمت کی صورت اختیار کریں گے اور معلوم حقائق کے ساتھ ایک عقلی ترتیب میں آ کر اس قدر واضح اور روشن ہو جائیں گے کہ کوئی شخص قرآن کی صداقت سے انکار نہ کر سکے گا''۔

قرآن نے اس کی پیشین گوئی یوں کی ہے:

﴿سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ﴾

(حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

''عنقریب ہم اُن کو اطرافِ عالم میں اور خود ان کے اپنے اندر بھی نشانیاں دکھائیں گے' یہاں تک کہ ان پر آشکارا ہو جائے گا کہ قرآن برحق ہے''۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ایک اچھی حکمت عملی اور پیش بندی کا تقاضا ہے کہ فوری طور پر ایسے علمی اور تحقیقی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں اس بے خُدا سائنس کی بنیاد پر پیش آنے والے اس علمی چیلنج کے بارے میں معلوم کیا جائے کہ اس کے عناصر اربعہ کیا ہیں اور انسانی فکر و نظر' انسانی اقدار اور علوم و فنون پر اس کے اثرات کیا ہیں۔ جہاں طلبہ کو وہ اساتذۂ کرام جو قرآن و حدیث کے مزاج اور روحِ عصر کے تقاضوں سے باخبر ہوں' ایک ایسا جاندار نصاب پڑھائیں جو چند سالوں میں اُنہیں اس قابل بنائے کہ وہ قرآن و حدیث کی اعلیٰ علمی سطح پر دورِ جدید کے اس علمی چیلنج کا جواب دے سکیں' جہاں سے طالب علم کتاب خواں نہیں بلکہ صاحبِ کتاب بن کر نکلے' جہاں علم کی موجیں طالب علم کو خاموش نہیں بلکہ کشمکشِ حیات سے باخبر اور ٹکر لینے کے لیے بے تاب بنا دیں۔ بقول اقبالؔ:

خُدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے' مگر صاحبِ کتاب نہیں!

❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز
ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبول عام تالیف
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
اشاعت خاص: 20 روپے اشاعت عام: 12 روپے

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : آخری صلیبی جنگ (حصہ چہارم)

مصنف : عبدالرشید ارشد

ضخامت : 274 صفحات ۔ قیمت:100روپے

ملنے کا پتہ:النور ٹرسٹ رجسٹرڈ' جوہر آباد

عبدالرشید ارشد دینی حلقوں کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ وہ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کی کئی کتابیں محکمہ تعلیم سے منظور شدہ بھی ہیں۔عبدالرشید ارشد قومی اور عالمی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کی کتابیں تحقیق وجستجو کا مستند مرقع ہیں۔عالمی حالات پر اُن کے تجزیے چشم کشا ہیں۔ان کی تحریروں سے اُمت مسلمہ کے عوام اور مقتدر افراد دونوں سبق سیکھ کر راہِ صواب اختیار کر سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی کو تاریخِ عالم کے ٹھوس شواہد کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔مصنف کے مطابق کفر کی یلغار انتہائی چابک دستی کے ساتھ تیار کی گئی منصوبہ بندی کے تحت کام کر رہی ہے اور کامیابی کے ساتھ ہمکنار بھی ہو رہی ہے' کیونکہ اسلامی دنیا اپنی تہذیب سے بیگانہ مغرب کی تقلید میں انتہائی دلچسپی کے ساتھ محو ہے۔ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان مغرب کی بے حیا تہذیب سے نفرت کرتے' اس کے قریب نہ پھٹکتے' بلکہ اس کو صحیح سمت پر لگانے کی کوشش کرتے۔

موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں یہودی ذہن کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہا۔امریکہ اور برطانیہ اُس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔چونکہ ان ممالک کی عسکری قوت جدید ترین سائنسی انکشافات پر مبنی ہے جس سے امت مسلمہ بے بہرہ ہے لہٰذا اسے جرم ضعیفی کی سزا کا سامنا ہے۔تاہم مصنف کے مطابق جہاں دشمنوں کی عداوت تمام اخلاقی اقدار کو پامال کر کے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ

توڑ رہی ہے وہاں مسلمانوں کی اپنے دین سے دوری کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ اگر مسلمان اسلام کے ساتھ مخلص ہو جائیں اور اتحاد کر لیں تو جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح دشمن کے دانت بھی کھٹے کر سکتے ہیں' لیکن اس نہج پر سوچنے کی بجائے مسلمان حکمران حقیقی دہشت گردوں کے ظالمانہ اقدام کی تصویب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' تاکہ وہ خود ظالم دہشت گردوں کے ظلم سے بچ سکیں۔ افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اس بستے رستے آزاد ملک پر آگ برسا کر خون کی ہولی کھیلنے میں مسلمانوں نے ظالم دہشت گردوں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اگلا نشانہ عراق کو بنایا گیا تو مسلمان حکمران چپ سادھے رہے۔ ظالم ہے کہ وہ ایک ایک کر کے مسلمان ممالک کو تہس نہس کر کے اُن کے وسائل پر قبضہ جمائے چلا جا رہا ہے اور اس کا یہ عمل کہیں رکتا نظر نہیں آتا۔

مصنف نے پوری دل سوزی کے ساتھ اُمت مسلمہ کے اتحاد کو وقت کی ضرورت قرار دیا ہے' ورنہ دہشت گردی کے اس سیلاب سے کوئی بھی اسلامی ملک نہیں بچ سکے گا۔

(۲)

نام جریدہ : اردو سائنس میگزین (سہ ماہی)

مدیر اعلیٰ : خالد اقبال یاسر

قیمت فی شمارہ: 20 روپے سالانہ چندہ: 80 روپے

ملنے کا پتہ : اردو سائنس بورڈ' 299۔ اپر مال' لاہور

اردو سائنس بورڈ وفاقی وزارت تعلیم' حکومت پاکستان کا ایک ادارہ ہے جو وطن عزیز میں سائنسی علوم کو اردو زبان میں فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ بورڈ کے کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج جو قوم سائنسی علوم میں آگے بڑھنے میں غفلت سے کام لے' وہ اقوام عالم کے درمیان عزت و وقار کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی۔ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہونے کے لیے سائنسی علوم میں ترقی ایک اہم ضرورت ہے۔ چونکہ آج سائنسی علوم میں یورپ اور امریکہ سب سے آگے ہیں اور وہاں سے حاصل ہونے والی بیشتر سائنسی معلومات انگریزی میں ہیں لہٰذا دیگر زبانوں والی قومیں اُن سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی جائے وہاں اپنی قومی زبان کو بھی اس قابل بنایا جائے کہ وہ جدید سائنسی علوم کی نشر و

اشاعت اور ترویج کی اہل ہو جائے۔

اگرچہ اردو زبان دنیا کی چند قابل ذکر اور اہم زبانوں میں سے ہے تاہم اس کو سائنسی علوم وفنون کی توضیح وتشریح کے قابل بنانا ابھی باقی ہے۔ اردو سائنس بورڈ کا قیام اسی مقصد کے حصول کی طرف ایک قدم کے طور پر عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ بورڈ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور گزشتہ ۲۴ سال کے دوران ۶۵۰ سے زائد کتابیں شائع کر چکا ہے۔

''اردو سائنس میگزین'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس رسالہ کو نہ صرف سائنس بلکہ اس سے متعلقہ دوسرے موضوعات پر بھی ماہر مضمون نگاروں کا تعاون حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں شائع ہونے والی تحریریں معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ کچھ عنوانات جریدے کی ہر اشاعت میں شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً سائنسی اطلاعات' دریافتوں اور تحقیق کے تازہ ترین نتائج کو ''اخبارِ سائنس'' کے تحت یکجا کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو سائنس بورڈ کی سرگرمیوں کی رپورٹ بھی ایک مستقل سلسلہ ہے۔ کسی معروف مسلم سائنس دان کے حالات اور کارناموں پر ایک مفصل تحریر بھی ہر شمارے کا حصہ ہوتی ہے۔ زیر نظر شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۵ء کی سہ ماہی کا ہے۔ اس میں بنو موسیٰ کی زندگی اور علمی خدمات کا ذکر ہے۔ ''یونان کا سفرنامہ'' پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ خود وہاں موجود ہوں۔ ''اکیسویں صدی کے اکیس طبی معجزات'' ایک نہایت معلوماتی تحریر ہے۔ ذیابیطس' جسے خاموش قاتل کا نام دیا گیا ہے' کی علامات اور اقسام عام فہم انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ ان تمام مضامین پر مستزاد جو چیز موجودہ شمارے کو ایک خاص نمبر کا درجہ دیتی ہے' وہ سونامی کی تباہ کاریوں کے بارے میں پندرہ صفحات پر مشتمل خصوصی تحریر اور اس کے ساتھ آٹھ رنگین صفحات کا ''سونامی البم'' ہے۔

''اردو سائنس میگزین'' کا ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔ سائنسی معلومات کا یہ بیش بہا خزانہ نہ صرف طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے بلکہ اس میں عام آدمی کے لیے بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے!oo

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات واحادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کے

رجوع الی القرآن کورس

میں داخلے کے لیے طالبانِ قرآن سے درخواستیں مطلوب ہیں!

تعلیم یافتہ حضرات کے لیے قرآن حکیم کو سمجھنے اور فہم دین کے حصول کا سنہری موقع

یہ کورس بنیادی طور پر گریجوایٹس اور پوسٹ گریجوایٹس کے لیے ترتیب دیا گیا ہے' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم گریجوایشن کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' انہیں اس کورس کے ذریعے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے —— تاہم بعض استثنائی صورتوں میں ایف اے کی بنیاد پر بھی اس کورس میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

نصاب

۱) عربی صرف ونحو
۲) ترجمہ قرآن (تقریباً پانچ پارے)
۳) آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل (تقریباً دو پارے)
۴) قرآن حکیم کی فکری وعملی راہ نمائی (منتخب دروسِ قرآن)
۵) تجوید وحفظ
۶) مطالعۂ حدیث
۷) اصطلاحاتِ حدیث
۸) اضافی محاضرات

o کورس کا آغاز ان شاء اللہ یکم ستمبر سے ہوگا اور کورس کا دورانیہ نو (9) ماہ ہوگا۔

کورس کا تفصیلی پراسپکٹس

جس میں داخلے سے متعلق ضروری معلومات کے علاوہ کورس میں شامل مضامین کی تفصیل' طریق تدریس اور نظام الاوقات کی وضاحت بھی شامل ہے' درج ذیل پتے سے حاصل کریں:

ناظم برائے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور (فون: 03-5869501)